عید الاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی

ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک فکر انگیز خطاب: ص

اکتوبر ۱۹۸۲

وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

مقام اشاعت :- ۳۶-کے - ماڈل ٹاؤن - لاہور

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

رلفریجریٹرز ، ایئرکنڈیشنز اور فریزرز میں سب سے بہتر

سانیو

SANYO

خریدیئے

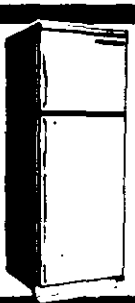

نوفراسٹ ریفریجریٹرز

اب پاکستان میں تیار/اسمبل کئے جاتے ہیں

۱۰ مختلف سائزیں۔ دلکش رنگوں میں حفاظتی تالے کے ساتھ۔ اشیاء کے ذخیرہ کرنے کی زیادہ گنجائش۔ بازار جانے کی کم زحمت۔ مکمل کارکردگی۔ آزمودہ ریفریجریٹرز بڑے قد و قامت کے ۳ دروازے والے فیملی ماڈلز سے لیکر مجرد اشخاص کے لئے چھوٹے ماڈلز تک دستیاب

بے آواز

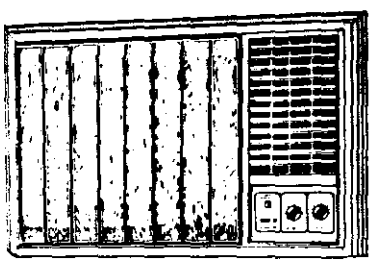

رُوم ایئرکنڈیشنز

گرمیوں میں سرد، سردیوں میں گرم ہوا

گنجائش ۱/۲ ٹن (۱۰۰۰۰ بی ٹی یو ایچ)

پاکستان میں تیار، اسمبل کردہ

ٹھنڈا کرنے کی زیادہ صلاحیت بجلی کا کم خرچ

بہتر کارکردگی کیلئے آٹو ڈیفیکٹر سے آراستہ

براؤن ٹیک میں فنش کی نئی جدت۔

اِسپلٹ ٹائپ ایئرکنڈیشنز

نیا روٹری کمپریسر آواز، ارتعاش اور بجلی کا خرچ کم کرنے کیلئے۔

دیوار پر نصب کیا جانیوالا ڈیزائن کمرے میں قابلِ استعمال جگہ بچاتا ہے

۲۴ گھنٹے کا وقتی سوئچ۔

آئی سی تھرموسٹیٹ صحیح ٹمپریچر برقرار رکھنے کے لئے

۳- اسپیڈ فین آپریشن سلیکٹر

دیوار فرش اور سیلنگ میں نصب کئے جانے کے قابل

ٹھنڈا کرنے کی صلاحیت ۱۵۰۰۰ تا ۲۵۷۰۰ بی ٹی یو

کرم فرما خصوصی توجہ فرمائیں:

متذکرہ مصنوعات خریدتے وقت ورلڈ وائیڈ کمپنی کی جاری کردہ پانچ سالہ گارنٹی ضرور حاصل کریں تاکہ سروس بعد از فروخت کی مفت سہولت سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

پاکستان میں سانیو تمام مصنوعات کے سول ایجنٹس:

ورلڈ وائیڈ ٹریڈنگ کمپنی

سانیو سینٹر شوروم اور سروس سینٹر۔ گارڈن روڈ۔ صدر کراچی

فون: ۷۷۳۶۴ - ۷۴۷۴۹ - ۷۴۷۰۰

پاکستان: کیبل "WORLDBEST" ٹیلکس 25109 WWTCO PK

786. WW-67/82

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا

ماهنامہ

میثاق

لاہور

جلد : ۳۱	شمارہ : ۱۰	ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ مطابق اکتوبر ۱۹۸۲ء

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید

سالانہ زرتعاون
۳۶/ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مشمولات

○ عرض احوال ——— ۳
جمیل الرحمٰن

○ درس قرآن ——— ۱۱
سورۃ ابراہیم آیات ۲۶، ۲۷
ڈاکٹر اسرار احمد

○ عیدالاضحٰی اور فلسفۂ قربانی ——— ۱۷
ڈاکٹر اسرار احمد

○ مولانا مودودی مرحوم اور میں ——— ۵۱
ڈاکٹر اسرار احمد

○ امام احمد بن حنبل رح ——— ۷۳
مولانا سید حسن مظہر مدنی

○ افکار و آراء ——— ۷۷

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ

سورۃ الاسراء۔ الآیۃ ۸۲

عطیہ: حاجی محمد سلیم

حاجی شیخ نورالدین اینڈ سنز لمیٹڈ (Exporters)

۳۰۱، لنڈا بازار، لاہور۔ ۳۰۶۴۲۸ / ۳۰۵۴۶۹

جمیل الرحمٰن

عرضِ احوال

نحمدہ ونصلی علےٰ رسولہ الکریم

الحمد للہ والمنہ کہ ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ مطابق اکتوبر ۸۲ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔ اس ضمن میں یہ کوشش پیش نظر ہے کہ یہ شمارہ عید الاضحیٰ سے قبل ہی قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ چونکہ اس شمارے میں عید الاضحیٰ اور فلسفہ قربانی سے متعلق محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ایک فکر انگیز خطاب شامل ہے جو موصوف نے گذشتہ سال بتاریخ ۲ ذی الحجہ ۱۴۰۱ھ بروز جمعہ مسجد دارالسلام لاہور میں کیا تھا۔ اس خطاب کے مطالعہ سے جہاں ان شاء اللہ عید الاضحیٰ اور قربانی میں جو ربط و تعلق ہے، وہ بھی قارئین کے سامنے آئے گا، وہاں وہ مغالطے بھی دور ہوں گے جو حج کے موقع پر منیٰ کے علاوہ دوسری جگہوں پر قربانی کی مخالفت میں منکرین حدیث کی طرف سے دیئے جاتے ہیں۔

پچھلے شمارے میں عرض کیا گیا تھا کہ ہمارے دین میں خوشی کی دو ہی تقاریب (تہوار) مقرر ہیں، ایک عید الفطر اور دوسری عید الاضحیٰ — پہلی کا تعلق روزے کی فرض عبادت کی تکمیل سے ہے اور دوسری کا تعلق فریضہ حج کی ادائیگی سے — فریضہ حج کی ادائیگی حجاز مقدس کے مخصوص مقامات سے متعلق ہے اور قربانی مناسکِ حج میں سے ایک رکن رکین منسک کا مقام رکھتی ہے۔ لہٰذا اس رکن کو اتنی وسعت دے دی گئی کہ روئے ارض میں بسنے والے تمام ذی استطاعت لوگوں کے لئے عید الاضحیٰ کی نماز کے بعد اللہ کے نام پر جانوروں کی قربانی واجب کر دی گئی ہے تاکہ حج کی برکات کا ایک حصہ تمام عالم کے مسلمانوں تک پہنچ جائے — احادیث صحیحہ میں حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت آتی ہے۔ جس کا مفاد یہ ہے کہ ہجرت کے بعد جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں قدم رنجہ فرمایا اور آپ

کا وجود قدسی وہاں تشریف لایا تو اہل مدینہ کے ہاں خوشی کی دو تقریبیں منائی جاتی تھیں ان تہواروں پر لوگ کھیل تماشوں کا سامان کیا کرتے تھے۔ اور لہو و لعب میں سرمست ہو جاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالےٰ نے تم مسلمانوں کے لئے ان دو تہواروں کے بجائے دو تقاریب مقرر کی ہیں جو تمہاری تقاریب کے مقابلے میں ہر پہلو اور ہر رُخ سے بہتر ہیں اور ان کا تعلق بھی تمہارے دین ہی سے ہے۔ ان میں سے ایک عیدالفطر ہے اور دوسری عیدالاضحیٰ ــــ پہلی کا تعلق صوم کی فرض عبادت کی تکمیل سے ہے کہ جس کے بعد مسلمان صدقۃ الفطر ادا کرتے ہیں اور کسی میدان میں (یا میدانوں کی کمی کی وجہ سے کسی جامع مسجد میں) شکرانے کے طور پر دوگانہ ادا کرتے ہیں دوسری کا تعلق حج کی عبادت سے ہے جو ۹ ذی الحجہ کو عرفات میں وقوف کی صورت میں ادا کیا جاتا ہے۔ حج کے دوسرے مناسک بھی ہیں، جن میں سے حجاج کے لئے ۱۰ ذی الحجہ کو دوگانہ ادا کرنے کے بجائے رمی جمار اور قربانی اور طواف افادہ کو ارکانِ رکین کی حیثیت حاصل ہے ــــ ان لوگوں کے علاوہ جو حج کے لئے گئے ہوئے ہیں پورے عالم کے مسلمانوں پر دوگانہ عیدالاضحیٰ اور ہر ذی استطاعت مسلمان کے لئے قربانی کو وجوب کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ یہ گویا حج کی برکات کی وسعت ہے۔

دُنیا میں مذہبی طور پر بھی اور قومی طور پر بھی تہوار منائے جاتے اور تقاریب ہوتی ہیں۔ لیکن جس طرح اسلام اور کفر کے مابین زمین و آسمان کا فرق ہے اسی طرح اسلام کی تقاریب اور دوسرے مذاہب اور دوسری قومی تقاریب میں بھی بُعد المشرقین ہے۔ ذات قدسی صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے سے قبل وہاں کی تقریبات میں کھیل تماشے لہو و لعب اور سرمستیاں ہوتی تھیں اس کا بیان حضرت انسؓ کی روایت میں موجود ہے۔ لیکن اسلام نے جو عیدیں مقرر کی ہیں وہ نہ صرف لہو و لعب سے پاک اور مبرا ہیں بلکہ انتہائی پُرشکوہ اور پُرمسرت اجتماعی مظاہرے کے باوصف عبادتِ ربّ کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ ان عیدین کا آغاز ہی اللہ تعالےٰ کی تکبیر، اس کی توحید اور اس کی تحمید و تمجید سے ہوتا ہے۔

ان میں نہ ڈھول ڈھماکا ہے نہ آتش بازی ہے غرض کہ ہاؤ ہو کا کوئی شائبہ بھی ان میں شامل نہیں ہے۔ بس، ایک ہی اعلان ہے اور وہ یہ ہے کہ

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ اِلّا اللہ و اللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد

"اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔ کبریائی کا سزاوار صرف اللہ ہے اس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں، صرف وہی معبودِ برحق ہے۔ اور سب سے بڑا صرف اللہ ہی ہے۔ کوئی اور نہ اس سے بڑا ہے نہ اس جیسا ہے اور ہر قسم کا شکر و سپاس اور تعریف و ثنا صرف اسی ذات کے لئے مختص ہے۔"

اور — اللہ اکبر اللہ اکبر کبیرا، سبحان اللہ کثیرا الحمد للہ بکرۃً و اصیلا۔

"اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔ کبریائی کا جامہ صرف اسی کو راست آتا ہے اور اسی کو زیبا ہے۔ وہ اللہ ہر عیب، ہر نقص اور ہر کمزوری سے قطعی اور حتمی طور پر مبرّا ہے۔ اللہ ہی کے لئے تمام شکر و سپاس اور تعریف و ثنا صبح و شام اُسی کے لئے ہے۔ کائنات کی ہر چیز اسی کی تسبیح و تحمید میں مصروف ہے۔"

مسلمان اللہ کی کبریائی، اس کی توحید، اس کی تسبیح و تحمید کے یہ نغمے الاپتے ہوئے ہر سمت اور ہر طرف سے ذوق و شوق سے سرشار ہو کر عید گاہ کا رُخ کرتے ہیں تاکہ اپنے رب کے حضور اس کے شکر و سپاس اور اس کی عبادت و طاعت کے لئے صلوٰۃ عید کی صورت میں دوگانہ ادا کریں۔ اور اسکے بعد سنت ابراہیمؑ کے مطابق جانوروں کی قربانی دیں۔

حکم ہے کہ بلند آواز سے تکبیرات پڑھتے ہوئے عید گاہ جاؤ اور واپسی میں راستہ بدل دو تاکہ پوری فضا اللہ کی کبریائی، اس کی توحید اور اس کی تحمید سے معمور ہو جائے۔ عید الاضحیٰ کے لئے حکم ہے کہ ۱۳ ذی الحجہ کی عصر کی نماز تک ہر نماز کے بعد بھی بلند آواز سے ان تکبیرات کو ادا کرو — تھوڑے سے غور سے معلوم ہوتا

[illegible]

ذریعے ہر نوع کے طاغوت اور باطل سے نہ صرف اعلان برات ہے بلکہ اعلانِ جنگ ہے — سورۃ المدثر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا تھا کہ: وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ - "اور اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کرو اور بالفعل اس کی کبریائی کو نافذ کرو" — دن میں پانچ وقت اذان اور اقامت میں اللہ کی کبریائی کا اعلان ہوتا ہے اور پھر عیدین کے موقع پر اجتماعی طور پر بہت وسیع پیمانے پر اس کا اعادہ ہوتا ہے - لیکن یا حسرتا! کہ ہم مسلمانوں نے محض زبان سے اللہ اکبر کہہ دینے کو کافی سمجھ لیا ہے - اس کی کبریائی کے بالفعل نفاذ کی ذمہ داری سے ہم غافل ہو گئے ہیں - حالانکہ بحیثیت مسلمان اور بحیثیت امتی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر واجب ہی نہیں فرض ہے کہ ہم پہلے اپنے ملک میں اللہ کی کبریائی کا نظام قائم کریں ہمارے انفرادی و اجتماعی تمام معاملات سے یہ بات ہویدا ہو کہ ہم محض زبانی کلامی اللہ کی کبریائی کے قائل و مقر نہیں ہیں بلکہ عملاً اسی کی کبریائی کے نظام کے پیرو ہیں۔ پھر دنیا کو بھی اس حق کو قبول کرنے کی دعوت دیں -

---

لیکن ہمارا حال اس کے بالکل برعکس ہے - ہم نے جہاں اسلام کے بعض احکام کو یا تو محض رسم بنا کر رکھ دیا ہے - اور یا بعض احکام کو پس پشت ڈال دیا ہے' اسی طرح ہم نے اپنی عیدوں کو بھی ایک رسم اور تہوار کی حیثیت دے رکھی ہے اور ہمیں خیال بھی نہیں آتا (الا ماشاء اللہ) کہ ہمارے دین کے یہ تمام احکام و شعائر اس لئے مقرر کئے گئے ہیں کہ ہمیں نسیان کی بھول بھلیوں سے نکال کر یہ یاد دلاتے رہیں کہ ہم اللہ کے بندے ہیں اور ہماری تخلیق کا مقصد عبادتِ رب ہے - ہم خود بھی اللہ کی عبودیت کے نظام کو اپنی انفرادی اجتماعی میں جاری و ساری کریں۔ اور دنیا کو بھی اس کی دعوت دے کر شہادت علی الناس کا فریضہ انجام دیں -

ہم قربانی کے جانوروں کو ذبح کرتے وقت پڑھتے ہیں کہ انی وجهت وجهی للذی فطر السمٰوٰتِ والارض حنیفاً وّ ما انا من المشرکین اور ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین وبذالك امرتُ وانا اوّل المسلمین - کاش ہم یہ الفاظ محض زبان سے ادا نہ کریں

بلکہ ان کو اپنے قلوب و اذہان میں اس طرح جاگزیں کرلیں کہ واقعی طور پہ ہماری زندگی میں ان عزائم کا عملی ظہور ہو۔

راقم کو اس موقع پر مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کا ایک قول بے ساختہ یاد آگیا۔ جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ مسلمان جیسے جیسے سنت اور دینی شعائر سے دور ہوتے جائیں گے۔ ویسے ویسے بدعات کے جنگلوں میں گم ہوتے چلے جائیں گے۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ اب ہمارے ہاں قومی و ملی سطح پر 'عیدین' کی وہ اہمیت نہیں رہی جو سنت نے قائم کی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ صورت ہوگئی ہے کہ اب عیدگاہ جاتے ہوئے بلند آواز سے تکبیرات کہنا شاذ ہی نظر آتا ہے۔ جبکہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر عیدگاہ جاتے اور آتے وقت بلند آواز سے تکبیرات ادا کرنا تمام فقہی مسالک میں متفق علیہ ہے۔ اس کی جگہ ہم نے دوسری قومی تقریبوں کو عیدین کے مقابلے میں بہت زیادہ اہمیت دے رکھی ہے۔ چنانچہ امسال ۱۴ اگست کو "یوم استقلال" جس شان و شوکت سے منایا گیا ہے اور اسے "عید آزادی" قرار دے کر اس کا جو اہتمام کیا گیا ہے، اس کو دیکھ کر دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ شہر کی تمام ہی قابل ذکر سرکاری، نیم سرکاری اور نجی عمارتیں بقعہ نور بنی ہوئی تھیں۔ پھر پورے ملک میں قومی پرچم کی جھنڈیاں ٹڈی دل کی طرح چھائی ہوئی تھیں ـــــ ایک طرف یہ عمل کہ قومی پرچم کو سلامی دیئے جانے کا اہتمام اور دوسری طرف یہ حال کہ قومی پرچم کی کاغذ جھنڈیاں ہوا کے زور سے اڑ کر سڑکوں پر پھیلی ہوئی تھیں اور قدموں تلے رُندھ رہی تھیں ـــــ ہمارے دین میں اس نوع کے "دن منانے" کی ہمارے محدود علم کی حد تک کوئی گنجائش نہیں ملتی۔ 'عیدین' کے علاوہ اگر خوشی کے "دن منانے" کی کوئی اہمیت ہمارے دین میں ہوتی تو "یوم بدر" وہ دن ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے "یوم فرقان" قرار دیا ہے۔ ـــــ اسی طرح "فتح مکہ" کا دن وہ دن ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ فتح میں پیشگی طور پر "فتح مبین" قرار دے دیا تھا۔ یہ سورۃ صلح حدیبیہ کے متصلاً بعد نازل ہوئی تھی اور یہ صلح دراصل "فتح مکہ" کا پیش خیمہ تھی۔ لیکن یہ دن منانے کا ہم کو نہ قرآن نے حکم دیا ہے اور نہ سنت نے اور نہ صحابہ تابعین تبع تابعین اور آئمہ فقہا نے ان دنوں

کو منانے کی ضرورت سمجھی — محتاط اندازہ یہ ہے کہ امسال "یوم استقلال" کو جس شان و شوکت سے منایا گیا ہے اس پر قومی سرمایہ کا تقریباً پچاس ساٹھ کروڑ روپیہ خرچ ہوا ہے - خواتین کی علیحدہ یونیورسٹیاں اور کالج بنانے کے لئے تو ہم قومی بجٹ میں عدم گنجائش کا عذر سنتے ہیں - لیکن ایسی تقاریب پر قومی فنڈ کا کروڑوں روپیہ بے دریغ خرچ کر دیتے ہیں، جس کا صرف وقتی خوش و خروش اور وقتی نمائش کے سوا کوئی ٹھوس نتیجہ قوم و ملت کو حاصل نہیں ہوتا — یہ معاملہ اور ایسے تمام معاملات اسراف کے ذیل میں آتے ہیں - جس سے ہمارا دین اجتناب کرنے کا حکم دیتا ہے -

---

پھر قابل غور بات یہ ہے کہ امسال اس شان و شوکت سے یوم استقلال اس حال میں منایا گیا ہے جبکہ مشرق وسطیٰ میں ہر لمحے مسلمانوں کا لہو یہودیوں کی بہیمیت و بربریت کے نتیجے میں بہہ رہا ہے - چودہ پندرہ سال سے بیت المقدس مغضوب علیہم قوم کے پنجہ استبداد میں ہے — اور مسلمانوں کی غیرت و حمیت کے لئے ایک چیلنج بنا ہوا ہے — خود ہمارے ملک کے پڑوس میں ایک مسلم ملک میں سرخ سامراج مسلمانوں کے لہو سے ہولی کھیل رہا ہے — اور ہماری سرحدوں پر خطرات منڈلا رہے ہیں — دوسری طرف وہ ملک ہے، جس کی برہمنی ذہنیت نے تا حال قیام پاکستان کو نہ ذہناً قبول کیا ہے اور نہ عملاً — پھر اس کے یہ عزائم بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں کہ وہ ایسے موقع کی منتظر ہے کہ جس سے فائدہ اٹھا کر وہ یا تو پاکستان کا وجود ہی ختم کر دے یا اُسے مزید ٹکڑوں میں بانٹنے کے لئے اقدامات کرے — ملک کے نظم و نسق کا بگاڑ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں، ڈکیتی اور منظم ڈکیتی روزمرہ کا معمول بن گئی ہے — تخریب کاری یا غفلت کے نتیجے میں تقریباً ہر ہفتے کوئی نہ کوئی خوفناک حادثہ رونما ہو رہا ہے — لیکن ان معاملات میں حکومت کی کارگزاری بھی سخت ناقابل اطمینان ہے اور قوم و ملت کی بے حسی بھی نہایت افسوس ناک ہے — بدر میں جب مشرکین مکہ کو شکست ہوئی تھی تو گھر گھر میں کہرام بپا ہو گیا تھا اور ابوسفیان نے (جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) قسم کھائی تھی کہ جب تک اس شکست کا بدلہ نہیں لے لیا جائے گا - میں نے کوئی

خوشبو استعمال کروں گا نہ پلنگ پر سوؤں گا — لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ عالم اسلام پر جو کچھ بیت رہی ہے نہ وہ ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کا باعث بن رہی ہے اور ہمارے ملک کی دو طرفہ سرحدوں پر جو خطرات منڈلا رہے ہیں اور اندرونی طور پر امن و امان کی جو ناگفتہ حالت ہے نہ وہ ہمیں اپنی ذمہ داریوں کے ادراک و شعور کو ہوشیار اور چوکنا کرنے کا سبب بن رہی ہے — قومی سطح پر اگر کسی قوم کے لچھن یہ رہیں تو اس قوم کا مستقبل سخت خطرے میں ہوتا ہے — کاش! ہم عبرت پذیری کی روش اختیار کریں اور انابت و رجوع الی اللہ کی طرف متوجہ ہوں ورنہ صورتِ حال یہ نظر آ رہی ہے جس کو علامہ اقبال مرحوم نے یوں ادا کیا تھا کہ

؎ وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے ۔۔۔ تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

گذشتہ ماہ ستمبر کے شمارے کے صفحہ ۱۵ پر یہ اعلان ہو چکا ہے کہ ان شاء اللہ العزیز قرآن اکیڈمی میں حسب دستور سالانہ مرکزی تربیت گاہ کا ۱۲ نومبر تا ۱۸ نومبر ۸۲ء انعقاد ہوگا۔ مقامی تنظیموں حلقوں اور منفرد رفقاء کو ہم مشورہ دیں گے۔ کہ وہ جس ٹرین سے لاہور آنے کا ارادہ رکھتے ہوں اس میں ۱۵ یوم قبل ہی اپنی سیٹ اور برتھ کی بکنگ کرا لیں اور مرکز کو فوری طور پر اطلاع دیں نیز اس بات سے بھی مطلع کریں کہ کس ٹرین اور کس تاریخ کو وہ واپس جانا چاہیں گے۔ مزید یہ کہ وہ واپسی کا خود انتظام کریں گے یا یہ چاہیں گے کہ مرکز کی جانب سے انتظام ہو۔ موخر الذکر صورت میں لازمی ہوگا کہ مطلوبہ معلومات مرکز کو ۲۰ اکتوبر تک مل جائیں تاکہ مرکز ۱۵ یوم قبل رفقاء کی واپسی کے لئے سیٹ اور برتھ کی بکنگ کا انتظام کر سکے۔ ان معلومات کی عدم موجودگی میں واپسی پر رفقاء کو نہایت مشکلات سے سابقہ پیش آئے گا — اس تربیت گاہ میں رفقاء کی شرکت لازمی ہوگی الّا یہ کہ کوئی واقعی عذر شرعی لاحق ہو۔ ایسی صورت میں عذر کی تفصیلی نوعیت کے ساتھ تحریری صورت میں مرکز کو معذرت بھیجی ایسے رفیق کے لئے لازم ہوگی — اس تربیت گاہ میں رفقاء کے علاوہ دوسرے حضرات بھی شرکت کر سکتے ہیں بلکہ مقامی تنظیموں یا حلقوں اور منفرد رفقاء کو کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ ایسے حضرات کو اس

تربیت گاہ میں شرکت کی دعوت دیں جو تنظیم سے قریب تر ہوں۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی، محترم قاضی عبدالقادر قیم تنظیم اسلامی اور عزیزم ڈاکٹر عارف رشید سلمہ کے ساتھ شمالی امریکہ کے دعوتی دورے پر تشریف لے گئے ہوئے ہیں۔ اب تک جو مختصر اطلاعات ملی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بحمداللہ یہ دورہ سابقہ دوروں کے مقابلوں میں کافی کامیاب ثابت ہو رہا ہے۔ شکاگو کے مضافات میں جو ہفت روزہ اقامتی تربیت گاہ قائم ہوئی تھی۔ اس کے متعلق بھی بڑی حوصلہ افزا خبر ملی ہے۔ لیکن یہ خبر اتنی مختصر ہے کہ اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان شاءاللہ نومبر کے شمارے میں قارئین کرام اس دورے کی تفصیلات سے آگاہ ہو سکیں گے۔

جولائی سے وسط اگست تک ڈاکٹر صاحب کے متعدد مقامات پر دعوتی دورے ہو چکے ہیں اور الحمدللہ ہر دورہ کامیاب رہا ہے۔ تنظیم کی دعوت ملک میں جگہ بنا رہی ہے۔ اس موقع پر ہمارے رفقاء کمر ہمت کس کر توسیع دعوت کے لئے زیادہ سے زیادہ اپنی توانائیاں صرف کر سکیں تو ان شاءاللہ بہت مفید نتائج نکل سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے امریکہ سے "مولانا مودودی اور میں" کی دوسری قسط ارسال فرما دی ہے جو یہاں ۱۶ ستمبر کو موصول ہوئی۔ چنانچہ یہ قسط بھی اس شمارے میں شامل ہے۔ "قربانی" والے خطاب اور اس قسط کی شمولیت کی وجہ سے چند مضامین جو اس شمارے کے لئے بالکل تیار تھے روکنے پڑ گئے ہیں جن کے لئے ہم معذرت خواہاں ہیں۔ اللہ کو منظور ہوا تو یہ مضامین آئندہ اشاعت میں پیش خدمت ہوں گے۔

عرصہ دراز سے رفقاء کا تقاضا تھا کہ ایک کتابچے میں "تنظیم اسلامی کی دعوت" کے اصول و مبادی اور خصائص آجائیں۔ ڈاکٹر صاحب تو تا حال اس موضوع پر تحریر کے لئے وقت نہیں نکال سکے۔ راقم نے موصوف کا ایک خطاب جو نومبر ۸۰ء میں اس موضوع پر کراچی میں ہوا تھا ٹیپ سے منتقل کر کے اسی نام سے تیار کر لیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب بڑی حد تک ایک دیرینہ ضرورت پوری کرے گی۔ یہ کتاب

ڈاکٹر اسرار احمد

نشری تقریر

درسِ قرآن

سُورۃ ابراھیم آیات ۲۶، ۲۷

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

امّابعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِن فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِن قَرَارٍ ۝ يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ج وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ ۚ وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ ۝ صدق اللہ العظیم

—— یہ سُورۃ ابراہیم کی آیات ۲۶ ، ۲۷ ہیں اور ان کا ترجمہ یہ ہے: "اور گندی بات کی مثال اس گندے درخت کی سی ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے ، اسے کوئی ثبات حاصل نہیں ہوتا - ثبات تو اللہ عطا فرماتا ہے - اہل ایمان کو محکم بات کے ذریعے دنیا کی زندگی کے دوران بھی اور آخرت میں بھی - اور بچلا دیتا ہے اللہ ظالموں کو اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے" —— ترجمہ ختم ہوا -

یہ ایک امر مسلّم ہے کہ عالمِ انسانی میں جو بھاگ دوڑ اور سعی و جہد بھی خواہ ذاتی و انفرادی سطح پر ہو رہی ہو خواہ قومی و اجتماعی سطح پر اُس کی اساس و بنیاد کسی نہ کسی نظریئے اور فکر پر قائم ہے - پھر یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ نظریہ خواہ صحیح ہو یا غلط اُس کے پھلنے پھولنے ، پروان چڑھنے اور برگ و بار لانے کا دار و مدار کدّ و کاوش ، محنت و مشقت اور سعی و عمل پر ہے - ذرا مزید غور کیا جائے تو ایک اور عظیم حقیقت جو سامنے آتی ہے وہ یہ کہ حقیقی ثبات و قرار اور دوام و پائیداری اور انجام کار کے اعتبار سے کامیابی و کامرانی اور نتیجہ خیزی اور بار آوری کے لیئے وہ دونوں چیزیں ناگزیر اور لازم و ملزوم کے درجے میں ہیں

جنہیں علامہ اقبال نے 'یقین محکم' اور 'عمل پیہم' سے تعبیر کیا ہے یعنی یہ کہ نظریہ اور فکر فی نفسہٖ بھی صحیح اور درست ہو پھر اس پر یقین بھی پختہ ہو اور محنت و مشقت بھی مسلسل اور پیہم کی جائے ۔ چنانچہ یہی ہے وہ عظیم حقیقت جو سُورۃ فاطر کی آیت ۱۰ میں ان الفاظِ مبارکہ میں بیان ہوئی کہ: "اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ"، یعنی کلماتِ طیّبات یا نظریاتِ صحیحہ اور افکار صالحہ میں ازخود بھی پروان چڑھنے اور پھلنے پھولنے یا بالفاظِ دیگر اللہ تعالیٰ کے مقام رفیع کی جانب صعود کی استعداد موجود ہوتی ہے ۔ انہیں اگر عمل صالح یا مخلصانہ سعی و جہد کا سہارا مزید حاصل ہو جائے تو یہ گویا "نورٌ علیٰ نور" کا مصداق ہے ۔ ان دونوں کے امتزاج سے جو صورت پیدا ہوتی ہے وہ ہمیں بتمام وکمال صحابہ کرام کی مقدس جماعت میں نظر آتی ہے جس کا نقشہ سُورۃ فتح کی آخری آیت میں تو ان الفاظ میں کھینچا گیا کہ: "کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَہٗ فَاٰزَرَہٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِہٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِہِمُ الْکُفَّارَ" — یعنی "جیسے وہ کھیتی جس نے نکالی اپنی سوئی، پھر اسے مضبوط کیا، پھر وہ گدری ہوئی اور پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہو گئی ۔ بھلی لگتی ہے کسان کو — تاکہ دل جلیں کافروں کے" جس کے بعد "وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْہُمْ مَّغْفِرَۃً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا" کے الفاظ میں تنبیہ کر دیا گیا کہ یہ سب نتیجہ ہے ایمان اور عمل صالح کے امتزاج کا — اور سُورۃ نور میں ایمان اور عملِ صالح کے ذکر کو مقدم کر کے نتائج کا تذکرہ بعد میں کیا گیا، ان الفاظ میں کہ: "وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّہُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ وَ لَیُمَکِّنَنَّ لَہُمْ دِیْنَہُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَہُمْ" — یعنی "اللہ کا وعدہ ہے کہ تم میں سے جو ایمان اور عمل صالح پر کاربند ہوں گے انہیں لازماً زمین میں خلافت سے سرفراز فرمائے گا جیسے کہ ان سے پہلوں کو خلافت عطا فرمائی تھی اور ان کے لئے ان کے اس دین کو تمکن عطا فرمائے گا جسے اس نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے!" — پھر یہی ہے وہ حقیقت

۲۴ و ۲۵ میں تمثیل بیان فرمائی ہے ایک ایسے ثابت و سالم اور قائم و دائم اور ثمرو سدابہار درخت کی جس کی جڑیں زمین میں مضبوطی سے قائم ہوں اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں اور وہ ہمیشہ پھل دیتا رہے — بفحوائے الفاظ قرآنی: "اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ ۢبِاِذْنِ رَبِّهَا" اور پھر دوبارہ موکد فرمایا اور مزید وضاحت فرمائی اس حقیقت کو اس کی آیاتِ زیرِ درس میں سے دوسری آیت یعنی آیت ۲۷ میں ان الفاظ میں کہ "يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ" —— یعنی "اللہ تعالےٰ ثبات عطا فرماتا ہے اہل ایمان کو 'قولِ ثابت' یعنی کلمۂ توحید یا کلمۂ ایمان کے ذریعے اس دُنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی"۔ واضح رہے کہ یہ ثبات اوّلاً داخلی یعنی قلبی اور رُوحانی ہوتا ہے جو عبارت ہے کیفیاتِ صبر و شکر، تسلیم و رضا اور توکل و تفویض سے جن کا حاصل ہے 'نفسِ مطمئنہ' یا زوالِ خوف و حزن بفحوائے الفاظِ قرآنی: "اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" اور ثانیاً اس کا ظہور ہوتا ہے زمین میں غلبہ و تمکن سے جس کا ذکر ہے سورۂ محمدؐ اور سُورۂ نور کی آیات متذکرہ بالا میں!

اس کے بالکل برعکس معاملہ ہے "کلمۂ خبیثہ" یعنی باطل افکار و نظریات' یا ملحدانہ و مشرکانہ عقائد و خیالات کا کہ نہ تو خود ان میں ثبات و دوام کی استعداد ہوتی ہے نہ ہی کوئی سعی و جہد ان کے لئے مستقل سہارا بن سکتی ہے - چنانچہ ان کی حیثیت اس عمارت کی سی ہوتی ہے جس کی بنیاد ہی کوئی نہ ہو اور سیلاب کا ایک ریلا بھی اسے زمین بوس کرنے کے لئے کافی ہو - یا اُس پودے کی سی ہوتی ہے جس کی جڑیں گہری نہ ہوں اور اسے بآسانی ایک ہی جھٹکے سے زمین سے اکھاڑ پھینکا جائے - جیسے کہ آیت ۲۶ میں فرمایا کہ "وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۨاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ" گویا باطل نظریات، یا ملحدانہ خیالات یا مشرکانہ عقاید کی مثال اس جھاڑ جھنکاڑ کی نوعیت کے بد ذائقہ کڑوے کسیلے اور بدبودار پھل دینے والے پودوں کی سی

ہے جنہیں گمراہ اور بدکردار لوگوں کی کوشش و محنت عارضی اور وقتی طور پر وجود و نمود کی صورت عطا کر دیتی ہے لیکن انہیں "رنگِ ثبات و دوام" کبھی حاصل نہیں ہو سکتا - بقول علامہ اقبال ؎

"ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثبات و دوام جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام!"

البتہ یہ بات واضح رہے کہ اہل باطل بھی اپنے مکروہ عزائم اور مذموم مقاصد کے تحت اپنے باطل نظریات و افکار کی خواہ وقتی اور عارضی طور پر ہی سہی ہوا ضرور باندھ دیتے ہیں اور انہیں کے نتیجے کے طور پر کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ اہل حق میں سے نسبتاً کمزور اور کم ہمت لوگ باطل کے اس عارضی جوش و خروش سے مرعوب و متاثر ہونے لگتے ہیں - چنانچہ ایسے ہی مواقع کے لئے وحیٔ آسمانی نے ابدی ہدایت سے سرفراز فرمایا ہے کہ "قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ" یعنی "اے نبی! کہہ دیجئے کہ پاک اور ناپاک کبھی برابر نہیں ہو سکتے - خواہ کبھی ناپاک کی کثرت (یا وقتی غلبہ) تمہاری نگاہوں میں کھبنے ہی لگ جائے!" —— ایسے مواقع پر اس بات کی شدید ضرورت ہوتی ہے کہ یہ حقیقت نگاہوں کے سامنے رہے کہ اس کائنات کو حضرتِ حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے "بالحق" تخلیق فرمایا ہے، باطل یا عبث نہیں!! لہٰذا یہاں انجام کار کے اعتبار سے کامیابی و کامرانی اور ثبات و دوام بھی صرف اہل حق کا حق ہے اہل باطل کا نہیں - اگرچہ اللہ تعالیٰ کی سُنّتِ ثابتہ یہ ہے کہ وہ اہل حق کی آزمائش و امتحان کے لئے باطل کو بھی تھوڑی سی مہلت دیتا ہے اور اس مہلت کے دوران وہ کچھ کھل کھیل بھی لیتا ہے اور اپنا ظاہری اور سطحی رُعب اور دبدبہ بھی قائم کر لیتا ہے لیکن اہل حق جب کلماتِ طیبہ اور عمل صالح کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اس پر حملہ آور ہوتے ہیں تو دیکھتے ہی دیکھتے "جاءَ الحق و زهق الباطل ان الباطل كان زهوقا" کا سماں بندھ جاتا ہے - اور اہل باطل کا سارا کیا دھرا نسیاً منسیاً اور ھباءً منثوراً ہو کر رہ جاتا ہے - چنانچہ یہ ہے وہ حقیقت جو آیت ۲۷ کے آخر میں ان الفاظ مبارکہ میں بیان فرمائی کہ: "وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ" یعنی

"اللہ ظالموں کو گمراہ کر دیتا ہے"۔۔۔ یہاں ظالموں سے مراد اصلاً مشرکین اور تبعاً وہ سب لوگ ہیں جن کے افکار غلط، نظریات باطل اور عقاید نادرست ہوں اور ان کو گمراہ کرنے سے مراد ان کی کوششوں کو بے نتیجہ اور اُن کی مساعی کو ناکام اور لاحاصل بنا دیا ہے۔ جیسے سُورۃ محمدؐ کی پہلی آیت میں فرمایا: "اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَضَلَّ اَعْمَالَھُمْ"۔۔۔ یعنی "جن لوگوں نے کُفر کیا اور اللہ کے راستے سے خود بھی رُکے اور دوسروں کو بھی روکا اللہ نے ان کے اعمال کو بھٹکا دیا" یعنی کالعدم یا بے نتیجہ و لاحاصل بنا دیا۔ یہی مضمون سُورۃ کہف کے آخری رکوع میں بھی آیا ہے: "قُلْ ھَلْ نُنَبِّئُکُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا ۞ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَھُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا" یعنی۔۔۔ "اے نبی کہیے کہ کیا میں تم لوگوں کو بتاؤں کہ اپنی سعی و جہد کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی سعی و جہد دنیا ہی کی زندگی میں بھٹک کر رہ گئی ہے اور (اس کے باوجود) وہ اس گمان میں ہیں کہ وہ بہت عمدہ اور نفع بخش کام کر رہے ہیں!"۔۔۔ یعنی کتنی قابلِ رحم ہے ان کی حالت کہ بھاگ دوڑ اور محنت مشقت بھی کر رہے ہیں لیکن چونکہ ان کا ہدف غلط ہو گیا ہے لہٰذا یہ ساری سعی و جہد رائگاں اور اکارت جا رہی ہے!۔۔۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجام بد سے اپنی امان میں رکھے! آمین۔۔۔

اس لئے کہ اُسے کل اختیار حاصل ہے وہ جسے چاہے اپنی پناہ اور حفاظت خصوصی میں لے لے۔ جیسے کہ زیرِ درس آیات کے آخر میں فرمایا: "وَیَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ" یعنی "اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے!"۔۔۔

صدق اللہ العظیم و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

ایک فنی و علمی کتاب

جسے عام آدمی بھی استفادہ کرسکتا ہے

"قلب"

تالیف:

ڈاکٹر سید اسلم

ایم بی بی ایس (پنجاب)، ایم آر سی پی (ایڈنبرا)

ایسوسی ایٹ پروفیسر

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیو ویسکلر ڈیزیز کراچی

شائع کردہ:

"منشورات ابجد"

۴۰۸ - پنورما سنٹر سمرسٹ اسٹریٹ

صدر، کراچی

عید الاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی

ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک خطاب

انشاء اللہ العزیز ۱۹ ستمبر ۸۲ء کو عید الاضحیٰ ہوگی۔ لہٰذا اس موضوع پر سال گذشتہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں جمعہ کو جو خطاب کیا تھا اس کو ٹیپ سے نقل کر کے معمولی حک و اضافے کے ساتھ قارئین کے مطالعے کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

الحمد للہ وکفیٰ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ــــ

اَمَّا بَعْدُ قال اللہ تبارک وتعالیٰ فی سورۃ الملک :

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط

وَقَالَ اللہ تعالیٰ وسبحانہٗ فی سورۃ البقرۃ:

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ ط قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ

اِمَامًا ط قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ط قَالَ لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ ط ۝

وَقَالَ اللہ تعالیٰ عزوجل فی سورۃ الصّٰفّٰت

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّہٗ لِلْجَبِیْنِ ۝ وَنَادَیْنٰہُ اَنْ یّٰٓاِبْرٰھِیْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ

الرُّءْیَا ج اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝ اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ۝

وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ ۝ وَتَرَکْنَا عَلَیْہِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ ۝

کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝ اِنَّہٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

صدق اللہ العظیم ط

رَبِّ اشْرَحْ لِی صَدْرِی وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ !

حضراتِ گرامی! اگلے جمعہ کو ۱۴۰۲ھ کی ۱۰ تاریخ ہو گی۔ لہٰذا اس روز عید الاضحیٰ کی اسلامی تقریب ہو گی۔ اسی مناسبت سے آج کے جمعہ کے لئے میں نے 'عید الاضحیٰ' کے موضوع پر اظہارِ خیال کا فیصلہ کیا ہے۔ اور اسی تعلق کی بنیاد پر میں نے آغاز میں سورہ ملک کی ایک آیت کا ٹکڑا، سورہ بقرہ کی آیت ۱۲۴ کا ابتدائی حصہ اور سورہ الصّٰفّٰت کی آیات ۱۰۲ تا ۱۱۱ تلاوت کی ہیں تاکہ اس عید کے بارے میں آج کچھ باتیں گوش گزار کر دی جائیں۔ اس عید کی نمایاں ترین اور امتیازی شان قربانی ہے۔ اس قربانی کا فلسفہ کیا ہے! یہ کس چیز کی علامت ہے! یہ وہ بات ہے جو خود صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کی تھی۔ یہ اس لئے کہ قرآن مجید نے صحابۂ کرام رضؓ میں یہ روح بیدار کر دی تھی کہ وہ احکامِ ربانی کی علتیں، مصلحتیں اور حکمتیں جاننے کی کوشش کریں۔ چونکہ قرآن مجید کا عمومی انداز یہی ہے کہ وہ جو حکم دیتا ہے تو اس کی علت و حکمت بھی بیان کر دیتا ہے۔ چنانچہ نماز کی حکمت یوں بیان کی گئی ہے کہ:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ — "نماز قائم کرو میری یاد کے لئے"

یہ صرف ایک رسم (Ritual) نہیں ہے، اس کا ایک متعین مقصد ہے — روزہ رکھنے کا حکم دیا تو ساتھ ہی اس کی حکمت بھی بتا دی کہ:

لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ — "تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے"

لہٰذا واضح کر دیا گیا کہ روزے کی یہ عبادت بھی محض ایک رسم نہیں ہے بلکہ اس کا بھی ایک معین مقصد ہے اور اس کی بھی ایک حکمت ہے۔ لہٰذا قربانی کی حکمت معلوم کرنے کے لئے صحابہ کرامؓ نے آں حضورؐ سے دریافت کیا کہ:

ما ھٰذہ الاضاحی یا رسول اللہ! — "حضور یہ قربانیاں جو ہم دیتے ہیں"

دیکھئے اس سوال کے انداز میں بھی ایک بہت پیارا نکتہ ہے۔ یعنی صحابہ کرامؓ عرض کر رہے ہیں کہ قربانی تو ہم دیتے ہی ہیں، چونکہ آپؐ نے اس کا حکم دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حکم پر عمل کرنے کا دار و مدار حکمت و علت اور مقصد کا جاننا، سمجھ لینا نہیں ہے حکم پر عمل تو اصلاً اس لئے ہو گا کہ وہ حکم اللہ یا اس کے رسولؐ کا ہے (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)۔ البتہ اس میں نہ صرف یہ کہ کوئی حرج نہیں ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ ہر

حکم پر غور و تدبر کرو اور احکام کی علتیں اور حکمتیں سمجھنے اور دریافت کرنے کی کوشش کرو۔ ہمارے فقہ میں اجتہاد اور قیاس کا جو معاملہ ہے احکام کی علت و حکمت کی دریافت پر ہی اس کا دار و مدار ہے۔ یہ ایک خود اپنی جگہ ایک علیحدہ بحث ہے کہ غور و تدبر سے سمجھنے کی کوشش کرو کہ کسی حکم کا کیا سبب و علت ہے؟ اس کی کیا حکمت و غایت ہے؟ اس کا کیا مقصد ہے؟ تو ہمارے دین نے اس کی حوصلہ شکنی کے بجائے اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ تو اسی سے ہمت پاکر صحابہ کرامؓ نے سوال کیا کہ ہم جو آپؐ کے حکم پر عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی دیتے ہیں تو ہمیں یہ بتائیے کہ یہ ہے کیا؟ یعنی اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس کا پس منظر کیا ہے؟ یہ کس چیز کے لئے بطور علامت ہے؟ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ: سُنَّةُ اَبِیْکُمْ اِبْرَاهِیْمَ۔ "یہ تمہارے باپ (حضرت) ابراہیمؑ کی سنت ہے" علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام۔ گویا کہ یہ اس عظیم الشان واقعہ کی یادگار ہے کہ جس میں ایک سو سالہ بوڑھے باپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے اکلوتے بیٹے کے گلے پر جو نوجوانی کے دور میں قدم رکھ رہا ہے چھری پھیر دی تھی۔ جو گویا کہ اللہ کی راہ میں قربانی کی آخری صورت ہو سکتی ہے کہ اپنی محبت، اپنے جذبات اور اپنے احساسات کو اللہ کی رضا جوئی کے لئے قربان کر دیا جائے۔ یہ وہ واقعہ ہے جو اس لحاظ سے نوعِ انسانی کی تاریخ کی ایک عظیم علامت (Symbol) بن گیا ہے اور اس طرح یہ قربانی ہمیشہ کے لئے شعائر دین میں شامل ہو گئی ہے۔ یہ اس قربانی کی روح کو بیدار اور برقرار رکھنے کا بھی ایک اہم ذریعہ بن گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو ایک بندۂ مومن سے مطلوب ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنی محبوب ترین چیز بھی قربان کرنے کے لئے تیار رہو۔ چنانچہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس قربانی کی یاد ہے جو ہر سال منائی جاتی ہے۔

اب میں چاہوں گا کہ آپ کو بتاؤں کہ اصل میں یہ قربانی حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی میں کس اہمیت کی حامل ہے۔ ان کی قربانیوں کا وہ کون سا سلسلہ ہے جس کا آخری نقطۂ عروج (Climax) یہ واقعہ ہے۔ اس ضمن میں میں نے ایک تو سورہ ملک کی ایک آیت کا ایک جزو آپ کو سنایا جس کے ذریعے حیاتِ دنیوی کے سلسلے کا جو فلسفہ قرآن بیان کرتا ہے، وہ بڑی جامعیت کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے ـــــ میں نے یہاں خاص طور پر "حیاتِ دنیوی کا فلسفہ" کے الفاظ ادا کئے ہیں۔

ہمارے دین کے نزدیک کل حیات یہ نہیں ہے۔ حیاتِ انسانی بہت طویل ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ جاوداں، پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی

لیکن یہ جو موت ہے اس کے ذریعہ سے حیاتِ انسانی کی طویل زندگی کا ایک انتہائی قلیل ٹکڑا کاٹ لیا گیا ہے۔ یہ جو ٹکڑا کاٹ گیا ہے یعنی موت سے پہلے پہلے کی زندگی، تو اس حصّے کو انسان دنیا میں بسر کر رہا ہے۔ اب سوچنا ہوگا کہ انسان کی اس دنیوی زندگی کی غرض و غایت کیا ہے! آیت مبارکہ کا یہ ٹکڑا کہ:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ "اس ذات یعنی اللہ تعالیٰ نے موت و
لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا حیات کا یہ سلسلہ اس لئے تخلیق فرمایا کہ
(اس کے ذریعے) تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے۔"

اس غرض و غایت کو بیان کر رہا ہے۔ 'با' 'لام' اور 'و' (بلو) یہ مادّہ عربی زبان میں پرکھنے کے لئے آتا ہے۔ اسی سے بابِ افتعال میں لفظ 'ابتلا' ہے۔ اسی سے لفظ 'بلوا' بنا ہے۔ چونکہ حرف "و" عموماً الف بن جاتا ہے۔ اس ابتلا کے ذریعے خوف کی حالت میں انسان کی ہمت، اس کے ثبات، اس کی عزیمت اور اس کے صبر کی آزمائش ہوتی ہے۔ یہ لفظ سورہ الصّٰفّٰت کی ان آیات میں بھی آیا ہے جن کی میں نے شروع میں تلاوت کی تھی۔

اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ۝ (اے ابراہیم) "یقیناً یہ ایک بہت
ہی نمایاں، واضح، کھلی اور کٹھن آزمائش تھی۔"

پس معلوم ہوا کہ خالقِ کائنات کی طرف سے موت و حیات کا یہ نظام، ابتلا، آزمائش، امتحان اور جانچنے اور پرکھنے کے لئے تخلیق فرمایا گیا ہے۔ ساتھ ہی اسی آیت میں اس جانچ اور پرکھ کی غایت بھی بیان کر دی گئی کہ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا یعنی وہ یہ دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے۔ تم جو اس دنیا میں اپنے خالق کی ذات سے محجوب کر دیئے گئے ہو اور اصل حقائق تمہاری نگاہوں سے اوجھل کر دیئے گئے ہیں۔ حقیقت الحقائق ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْحَقُّ۔ الحق اللہ کی ذات ہے اور وہ آنکھوں سے اوجھل ہے۔ اب تمہاری آزمائش اور تمہارا امتحان اس میں ہے کہ ہم نے تم کو جو استعدادات دی ہیں 'عقل' 'نظر' اور تفکّر و تدبّر کی جو صلاحیتیں عطا کی ہیں جو بصیرتِ باطنی عنایت کی ہے تو ایک تو ان کے ذریعے

ہم کو پہچانو۔ ان آنکھوں سے دیکھے بغیر، دل کی آنکھوں سے ہمیں دیکھو اور ہماری معرفت حاصل کرو ـــــ پہلی آزمائش یہ ہے۔ یہ تو گویا نظری، فکری، عقلی اور علمی آزمائش ہے کہ آیا تم حجابات ہی سے محجوب ہو کر رہ جاتے ہو، پردوں ہی کے نقش و نگار دیکھنے میں محو ہو جاتے ہو، یہیں کی ظاہری آرائش و زیبائش تمہیں مبہوت کر دیتی ہے اور تم اسی کے اندر گم ہو کر رہ جاتے ہو جس کو علامہ اقبال مرحوم نے یوں تعبیر کیا ہے کہ ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے

ہم نے تمہیں پردوں میں رکھا ہے۔ پھر پردے بھی بڑے خوشنما ہیں۔ اس زمین میں جو کچھ ہے اس کو ہم نے اس کی زینت کے لئے بنایا ہے۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی الْاَرْضِ زِیْنَۃً لَّھَا۔ "اس کائنات میں جو کچھ ہے، وہ دراصل اس زمین کی زیبائش و آرائش اور سنگھار ہے"

اس میں بھی ایک آزمائش ہے، ابتلا ہے، امتحان ہے۔ تو پہلی آزمائش عقل اور فکر و نظر کی آزمائش ہے۔ انسان کی جو قوتِ نظری ہے اس کا امتحان ہے کہ یہ انسان اپنے رب، مالک اور خالق کو پہچانتا ہے یا نہیں ـــــ دوسری آزمائش انسان کے ارادے، عمل اور سیرت و کردار کی پختگی سے متعلق ہے۔

اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ "تم میں سے خوب ترین عمل کون کرتا ہے"

اب اگر اپنے مالک و خالق حقیقی کو پہچان لیا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہیئے کہ انسان اسی سے دل لگائے، اسی سے لو لگائے، اسی کو مطلوب و مقصود بنائے، اس کی عبادت و اطاعت کرے۔ اب قدم قدم پر امتحانات آئیں گے۔ دنیا کی چیزیں انسان کو اپنی طرف کھینچیں گی۔ بقول شاعر کہ 'اِدھر جاتا ہے دیکھیں یا اُدھر پروانہ آتا ہے'، وہ ان آرائشوں اور زیبائشوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے یا ہماری طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ان کو مطلوب و مقصود بناتا ہے یا ہمیں مطلوب و مقصود بناتا ہے۔ اگر اس کے سامنے یہ متبادل ـــــ (Alternatives) راستے رکھ دیئے جائیں کہ یا اللہ کے راستے پر چلو یا اپنے عزیزوں کو چھوڑو وطن کو خیرباد کہہ دو تو دیکھیں وہ کونسا راستہ اختیار کرتا ہے۔! وہ وطن اور اپنے اعزّہ کے حق میں فیصلہ کرتا ہے یا اللہ کے حق میں فیصلہ کرتا ہے ! ـــ اگر اس کے سامنے یہ

کو چھوڑتا ہے! اگر اس کے سامنے یہ معاملہ آجائے کہ اپنی زندگی کی قربانی قبول کرے یا اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کا رشتہ توڑ دے اور معبودانِ باطل کی پرستش کرنے لگے!۔ تو دیکھیں کہ اس کے بارے میں اس کا فیصلہ کیا ہوتا ہے؟ ـــــ اور اگر اس کے سامنے یہ مرحلہ آجائے کہ دنیا کی جو محبوب ترین شے ہو سکتی ہے اس کی محبت اور اللہ کی محبت کے درمیان فیصلہ کرنے کو کہا جائے تو دیکھیں وہ کدھر کا رُخ کرتا ہے ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں — اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

یہ کل امتحان ہے ـــــ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ پہلا امتحان، عقل و فکر کا امتحان ہے۔ دوسرا امتحان، ارادے، نیت، سیرت و کردار اور عمل کا امتحان ہے۔ تو یہ ہے امتحان اور یہ ہے زندگی کی اصل غرض و غایت۔ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ ـــــ اس کی ترجمانی بھی علّامہ اقبال مرحوم نے بڑی خوبصورتی سے کی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب! — اِس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

یہ جو ہماری زندگی ہے، حباب کی مانند ہے۔ بڑی عارضی، بڑی فانی۔ بلبلہ اب پھٹا کہ اب پھٹا۔ بلبلے کی اس سے زیادہ اور کیا حیثیت ہے۔ اس حیاتِ دنیوی کی پائیداری پر کوئی اعتماد نہیں ہو سکتا کہ یہ کب تک رہے گی۔ لیکن جتنی دیر بھی یہ بلبلہ قائم رہے، اس کی بھی ایک غرض و غایت ہے۔ وہ بھی عبث نہیں ہے۔ ذرا اس کائنات کی وسعتوں کا تصور کیجئے، جس کو علّامہ مرحوم نے اس شعر میں قلزم سے تعبیر کیا ہے۔ پس یہ زندگی ایک آزمائش اور امتحان سے زیادہ کوئی حیثیت اور وقعت نہیں رکھتی ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے — پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

اس امتحان کی جو کامل و مکمل مثال قرآن مجید پیش کرتا ہے، وہ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا علیہ السّلام کی زندگی ہے۔ چنانچہ میں نے دوسری آیت سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۱۲۴ کے ابتدائی حصّہ کی سنائی تھی:۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ	"اور یاد کرو کہ جب آزمایا ابراہیمؑ
بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ	کو اس کے رب نے بڑی بڑی باتوں

میں تو وہ ان سب میں پورا اتر گیا۔" ـــــ ۱۲۱

اس میں لفظ ابتلا آگیا۔ بَلَاء، یَبْلُوْ، جس کے معنی کسی کو آزمانا، امتحان

وآزمائش میں ڈالنا ــــ یہاں لفظ بِکَلِمٰتٍ میں تنوین تنکیر کے لئے آئی ہے اس نے اس کو نکرہ بنا دیا ہے اور تنکیر عربی زبان میں تفخیم کے لئے آتی ہے۔ کسی چیز کی عظمت وشان کو بیان کرنے کے لئے آتی ہے۔ بِکَلِمٰتٍ میں بڑے بڑے اور کٹھن امتحانات کا مفہوم شامل ہوگیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے اس کے رب نے بڑے سخت اور مشکل امتحانات لئے لیکن اس اللہ کے بندے نے سب کو پورا کر دکھایا۔ فَاَتَمَّهُنَّ۔ اس کی قوتِ ارادی میں کہیں ضعف وتامل اور تذلل پیدا ہی نہیں ہوا۔ اس کی عزیمت میں کمزوری اور تذبذب کے کہیں آثار ہویدا ہی نہیں ہوئے ــــ جب حضرت ابراہیمؑ ان امتحانات کو پاس کر گئے تو ان کو یہ بشارت دی گئی:۔

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ط (تو اللہ تعالےٰ نے) کہا (اے ابراہیمؑ)

یقیناً میں تجھے پوری نوع انسانی کا امام بنانے والا ہوں"

حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام نے بربنائے طبع بشری فوراً سوال کیا: وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ط اے اللہ یہ وعدہ صرف مجھ سے ہے یا میری نسل سے بھی ہے! جواب ملا: قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ۝ "میرا یہ عہد ظالموں کے ساتھ نہیں ہوگا۔" تمہاری نسل میں سے جو ظالم ہوں گے وہ اس وعدے کے مستحق نہیں ہوں گے۔ "ظلم" کے متعلق میں اکثر دروس میں ذکر کر چکا ہوں کہ قرآن کریم میں اکثر وبیشتر 'ظلم' کے لفظ سے شرک مراد ہوتا ہے۔ تمہارا اصل کمال یہ ہے کہ تم نے توحید کی ترازو میں پورا اتر کر دکھایا۔ اس کی وجہ سے تم "امام الناس" کے مقام پر فائز کئے جا رہے ہو۔ اب اگر تمہاری نسل میں سے جو لوگ مشرک ہو جائیں گے تو وہ میرے اس عہد کے حق دار کیسے ہو سکتے ہیں! ــــ اس مفہوم کو بھی علامہ اقبال مرحوم نے بڑے سادہ الفاظ میں ادا کیا ہے ؎

پھر پسر لائق میراثِ پدر کیونکر ہو

معاملہ کسی اصول کے تحت ہوگا۔ محض نسل کے اعتبار سے ہو تو یہ انصاف، عدل اور قسط کے منافی ہوگا۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پہلا امتحان تو ان کے فکر و نظر اور عقل وشعور کا تھا۔ اس امتحان میں کتنی عظیم الشان کامیابی انہوں نے حاصل کی اس کا ذکر سورۃ الانعام میں ہے۔ انہوں نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی جس میں ہر

نوع کے شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے۔ توحید کی کوئی کرن کہیں موجود تھی ہی نہیں۔ شرک کی جتنی اقسام ہو سکتی ہیں، وہ سب موجود تھیں[1] سیاسی شرک یعنی غیر اللہ کی حاکمیت کا شرک وہاں موجود تھا۔ بادشاہِ وقت نمرود خدائی حقوق کا دعویدار بن کر تختِ حکومت پر متمکن تھا۔ مذہبی شرک کی حیثیت سے ستارہ پرستی وہاں تھی۔ سورج اور چاند، ثریا اور دوسرے ستارے وہاں پوجے جا رہے تھے۔ اصنام پرستی وہاں موجود تھی۔ بت کدے وہاں موجود تھے۔ اسی طریقے سے پروہتوں اور پنڈتوں کا نظام وہاں موجود تھا۔

یہ تفصیل اگرچہ قرآن میں تو بیان نہیں ہوئی لیکن عام روایت یہی ہے کہ حضرت ابراہیم خود ایک پروہت کے گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ آذر صنم گر بھی تھا اور ان کے ہاں جو مذہبی Monarchy رائج تھی اس میں اس کا ایک مقام تھا اور اس کے پاس ایک منصب تھا۔ تو تمام انواع و اقسام شرک موجود۔ شرک کا گھٹا ٹوپ اندھیرا اس میں حضرت ابراہیمؑ اپنی فطرت و عقلِ سلیمہ کی رہنمائی میں نظری، فکری اور عقلی سفر کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھر کر یہ نعرۂ توحید ان کی زبان پر آتا ہے کہ: اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ یہ نعرہ مومنانہ اس ماحول میں دراصل نعرہ بغاوت ہے کہ "میں تمہارے تمام معبودوں کا انکار کرتا ہوں اور میں نے یک سو ہو کر اپنا رخ اس ذات کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔" پھر انہوں نے بڑے مؤثر انداز میں اپنے والد اور اپنی قوم کی گمراہیوں پر ٹوکا: اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّیْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ (الانعام) اسی طرح اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِیْلُ الَّتِیْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۝ (الانبیاء) مختلف پیرایہ بیان اور اسالیب سے بار بار انہوں نے اپنے والد اور قوم سے کہا کہ "کیا ہیں یہ مورتیاں جو تم نے گھڑ لی ہیں جن کا تم دھیان اور گیان کر کے بیٹھتے ہو۔ جن کی تم ڈنڈوٹ کرتے ہو۔"

---

[1] اقسامِ شرک پر محترم ڈاکٹر صاحب کی تقریر قسط وار ماہنامہ میثاق میں شائع ہو چکی ہے ان شاء اللہ العزیز جلد ہی کتابی شکل میں یہ تقریر شائع ہو گی

قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۝ (الصّٰفّٰت) "(ابراہیم نے) کہا کیا تم اپنی ہی تراشی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو" ـــــ پھر آخری چوٹ لگاتے ہیں یہ فرما کر کہ :

اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (الانبیاء)	"تمہیں کیا ہو گیا ہے ؟ تف ہے تم پر اور تمہارے ان معبودوں پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پوجا کر رہے ہو۔ کیا تمہاری عقل ماری گئی ہے ! کیا تم عقل سے بالکل عاری ہو چکے ہو ؟ "

پھر پوری جرأت مؤمنانہ کے ساتھ چیلنج کرتے ہیں :

وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝ (الانبیاء)	"اور خدا کی قسم میں تمہاری عدم موجودگی میں تمہارے ان بتوں کے ساتھ کوئی معاملہ کر کے رہوں گا۔ ان کی خبر لے کے رہوں گا۔"

یہ جو نعرہ ہے، یہ جو بیداری ہے، یہ جو عزائم ہیں ایک ایسے ماحول میں جہاں توحید باری تعالیٰ سے کوئی ادنیٰ سی واقفیت بھی موجود نہیں ہے تو یہ ان کی فطرت و عقلِ سلیم کی آزمائش کا پہلا مرحلہ ہے۔ پہلا امتحان ہے، جس میں وہ شاندار طریقے پر کامیابی حاصل کرتے ہیں ـــــ اب دوسرا امتحان عمل کا شروع ہوا۔ قوتِ ارادی کی آزمائش کی ابتداء ہوئی۔ سیرت و کردار کی پختگی کو کسوٹی پر پرکھنے کے عمل کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے کشمکش تو اپنے والد بزرگوار سے ہوتی ہے۔ سورۂ مریم میں اس کا ذکر ہے کیسی لجاجت کے ساتھ اپنے والد کو توحید کی دعوت پیش کرتے ہیں کہ 'ابا جان آپ یہ کیا کر رہے ہیں ؟ ـــــ

"يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ط"	"ابا جان شیطان کی بندگی نہ کیجئے ! شیطان کی پرستش نہ کیجئے۔"
اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝	"بلاشبہ شیطان تو رحمان کا نافرمان ہے۔"
يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝	"ابا جان ! مجھے اس کا بڑا اندیشہ ہے کہ آپ کو اللہ کا عذاب آ دبوچے اور آپ کو

اللہ کی سزا پکڑ لے اور آپ شیطان کے ساتھیوں میں سے ہو جائیں"
اس سے پہلے بڑی لجاجت سے کہہ چکے ہیں کہ

يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ — "ابا جان میرے پاس ایک ایسا علم آیا
مَا لَمْ يَأْتِكَ — ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا"
فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ٥ — "پس آپ میری پیروی کیجئے، میرا کہنا
مانیئے۔ میرے راستے پر چلئے۔ میں آپ کو بتاؤں گا کہ سیدھا راستہ کون سا ہے"

لیکن اس تمام لجاجت اور پورے ادب و احترام کو پیش نظر رکھتے ہوئے پیش کی ہوئی دعوت کا جو جواب ملا وہ یہ تھا کہ:

قَالَ أَرَاغِبٌ أَنْتَ عَنْ آلِهَتِي — "اے ابراہیم! کیا تم میرے معبودوں
يَا إِبْرَاهِيمُ لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ — سے روگردانی کر رہے ہو" — ہماری
لَأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا ٥ — قومی و نسلی روایات ان سب کو اپنے
پاؤں تلے روند دینا چاہتے ہو — "اگر تم باز نہیں آؤ گے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا" یہ تو خیر بعد کی بات ہے اس وقت تم ہمیشہ کے لئے مجھ سے دور ہو جاؤ — اور فوراً میرے گھر سے نکل جاؤ:"

وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا ٥ میرے گھر کو فوراً چھوڑ دو۔ میری آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے دور ہو جاؤ۔
حضرت ابراہیمؑ جواب میں کہتے ہیں:

قَالَ سَلَامٌ عَلَيْكَ سَأَسْتَغْفِرُ — "آپ پر سلامتی ہو میں اپنے رب سے
لَكَ رَبِّي — دعا کروں گا کہ وہ آپ کو معاف کر دے"
إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا ٥ — "یقیناً میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے"

وہ اللہ کا بندہ گھر سے نکل رہا ہے باپ کو سلام کر کے۔ اس جھڑکی، سنگسار کرنے کی دھمکی اور گھر سے ہمیشہ کے لئے نکالے جانے پر بھی اللہ کا یہ بندہ کہتا ہے کہ سَلَامٌ عَلَيْكَ اور اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ میں اپنے رب کی بارگاہ میں جو مجھ پر بڑا مہربان ہے میں آپ کے لئے استغفار کروں گا" ارادے، عزم اور سیرت و کردار کی پختگی کا یہ پہلا امتحان ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام پورے اترتے ہیں — اب آیا معاملہ عوام کا — وہ عوام جو فی زمانہ خدائی کے مدعی ہیں۔ کبھی ایک فرد حاکمیتِ مطلقہ کا مدعی ہوا کرتا تھا اب عوام

اس کے مدعی ہیں ـــــ بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا ـــــ اب آپ حضرت ابراہیمؑ کی قوم کے جذبات واحساسات اور ان کے عقائد کا اندازہ کیجئے ـــــ کسی کو ہندو قوم کا ذرا سا بھی تجربہ ہو تو وہ جانتا ہوگا کہ بتوں کے اور ان کے جو تبکدے اور اصنام خانے ہیں ان کے بارے میں ان کے جذبات واحساسات کیا ہیں! ایسے شخص کو اندازہ ہوگا کہ کتنی جرأت مؤمنانہ تھی حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کہ انہوں نے کس قدر عظیم کام کیا ہے کہ ان کے سب سے بڑے صنم خانے میں جاکر ان کے تمام بتوں کو، سب سے بڑے بت کو چھوڑ کر توڑ پھوڑ ڈالا اور اس طور ان کے تمام عقائد پر ضرب کاری لگادی۔ یہ واقعہ سورہ الانبیاء میں قدرے تفصیل سے آیا ہے۔ انہوں نے قسم کھائی تھی کہ میں ان بتوں کی خبر لوں گا جس کا میں ذکر کرچکا ہوں۔ اس کے بعد ایک موقع پر جبکہ شہر کے تمام لوگ کسی تہوار کے سلسلے میں پوجا پاٹ اور میلہ میں شرکت کے لئے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے جیسے ہندوؤں میں بھی بعض تہوار شہر سے باہر منائے جاتے ہیں، حضرت ابراہیمؑ نے ان کے سب سے بڑے تبکدے میں جاکر ان کے بڑے بت کو چھوڑ کر سب کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور تیشہ بڑے بت کے گلے میں لٹکا دیا۔ یہ اس لئے کہ شاید ان کی قوم حقیقت نفس الامری کی طرف رجوع کرسکے۔

قرآن مجید اس واقعہ کا اس طرح ذکر کرتا ہے:

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا	چنانچہ اس نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا
لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ۝	اور صرف ان کے بڑے کو چھوڑ دیا تاکہ شاید
قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ	وہ ان کی طرف رجوع کرسکیں (انہوں نے
اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَالُوْا	آکر بتوں کا یہ حال دیکھا تو) کہنے لگے "ہمارے
سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ	خداؤں کا یہ حال کس نے کردیا؟ بڑا ہی ظالم
لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ۝ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ	تھا وہ۔" (بعض لوگ) بولے "ہم نے
عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ	ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا۔
يَشْهَدُوْنَ ۝ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ	جس کا نام ابراہیم ہے۔" انہوں نے کہا "تو
فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝	پکڑ لاؤ اسے سب کے سامنے تاکہ لوگ
قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا	دیکھیں (کہ اس کی خبر کیسے لی جاتی ہے)۔"
فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ۝	(ابراہیمؑ کے آنے پر) انہوں نے پوچھا،

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۙ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ۝ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ۝ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

(الانبیاء آیات ۵۸ تا ۶۷)

کیوں ابراہیمؑ، تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟" اس نے جواب دیا "بلکہ یہ سب کچھان کے اس سردار نے کیا ہے ان ہی سے پوچھ لو۔ اگر یہ بولتے ہیں۔ یہ سن کر وہ اپنے ضمیر کی طرف پلٹے اور (اپنے دلوں میں) کہنے لگے "واقعی تم خود ہی ظالم ہو" مگر پھر ان کی مت پلٹ گئی اور بولے" تو جانتا ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں" ابراہیمؑ نے کہا "پھر کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کو پوج رہے ہو جو نہ تمہیں نفع پہنچانے پر قادر ہیں نہ نقصان۔ تف ہے تم پر اور تمہارے ان معبودوں پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پوجا کر رہے ہو۔ کیا تم کچھ بھی عقل نہیں رکھتے؟"

ان آیات میں "فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۙ" والی آیت خاص طور پر قابل غور ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے اسلوب گفتگو، انداز تبلیغ اور استدلال و حجت نے ان مشرکوں کو نہ صرف مبہوت کر دیا لاجواب کر دیا بلکہ اس کا اس حد تک اثر ہوا کہ لوگوں نے اپنے گریبانوں میں جھانکا اور محسوس کر لیا کہ بات ابراہیمؑ ہی کی صحیح ہے، اصل میں ہم ہی غلطی پر ہیں۔ قرآن حکیم کہتا ہے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بطور حجت ان سے یہ کہا: قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ۝ اس بڑے بت نے توڑ پھوڑ کا یہ کام کیا ہوگا۔ چونکہ یہ وقوع واردات پر موجود بھی ہے اور آلۂ واردات بھی اس کے پاس ہی سے برآمد ہوا ہے۔ گویا عام واقعتی شہادتیں (Circumstancial Evidences) تو اس بڑے بت کے خلاف جا رہی ہیں۔ پھر یہ تمہارے معبودان جو ٹوٹے پھوٹے اور بکھرے پڑے ہیں تو اگر یہ بول سکتے ہوں تو انہی سے پوچھ لو کہ ان کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی ہے؟" اس حجت سے انہوں نے اپنے دلوں میں محسوس تو کر لیا کہ مت تو ہماری ہی ماری گئی ہے۔ یہ بت بول کب سکتے ہیں۔ یہ بات ان کی زبان پر بھی آ گئی کہ اے ابراہیمؑ تو تو جانتا ہے کہ یہ بول نہیں سکتے

لیکن دل میں کسی حقیقت کا منکشف ہو جانا اور بات ہے اور اس حقیقت کو دل و جان سے قبول کر لینا اور اس کا اقرار کر لینا بالکل دوسری بات ہے ـــــ ؎

زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

دنیا میں ہر دور میں ایسے اشخاص کی کمی نہیں رہی بلکہ معتدبہ تعداد رہی ہے جن پر حقیقت نفس الامری منکشف تو ہو جاتی ہے لیکن ان میں اس کو قبول کرنے کی ہمت اور اس کا حوصلہ نہیں ہوتا ـــــ مقابلتاً ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں جن کے اندر کی بصیرت اور اندر کا انسان بالکل مر چکا ہوتا ہے اور ان کی عقل پر پتھر پڑ چکے ہوتے ہیں ـــــ اگر انسان کے باطن میں حیات معنوی کسی درجے کے اندر باقی ہو تو حقیقت کا ادراک ہو جاتا ہے۔ لیکن اس انکشاف حقیقت کا اعتراف کر لینا۔ اس کو تسلیم و قبول کر لینا یہ آسان کام نہیں ہے ـــــ مصلحتیں ہیں، چودھراہٹیں ہیں، مفادات ہیں، جو دامن کو پکڑ لیتے ہیں۔ اب وہاں جو پجاری، پنڈت اور پروہت ہوں گے ان کے مفادات اور ان کے Vested Interest آخر کیسے پوجا پاٹ اور اصنام پرستی کے نظام کے خاتمے کو گوارا کر لیں گے! ـــــ اصنام پرستی میں جو نذرانے بتوں پر چڑھائے جاتے ہیں غور کیجئے کہ وہ نذرانے اور وہ حلوے منڈے آخر جاتے کہاں ہیں! وہ ان ہی پروہتوں اور پنڈتوں کے یہاں ہی تو جاتے ہیں ـــــ پھر بادشاہی کا جو نظام چل رہا ہوتا ہے، وہ بھی ان نذرانوں اور چڑھاووں سے اپنا حصہ وصول کرتا ہے چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کی حجت کی اس عملی تدبیر سے ان پر حقیقت تو منکشف ہو گئی لیکن وہ اس کو قبول نہ کر سکے ـــــ اس امتحان میں بھی حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سرخرو ہوتے ہیں۔ ورنہ خود سوچئے کہ اس Situation میں ایک Mob کا مواجہہ کرنا کیا آسان کام تھا!!

عوام کے ساتھ اس مقابلے میں کامیاب ہو جانے کے بعد اب حکومت و اقتدار وقت سے مقابلہ کی نوبت آتی ہے۔ اس سے محاجہ، مباحثہ اور تصادم ہوتا ہے ـــــ عوام کے ساتھ جو معاملہ ہوا اس کا ذکر سورۃ الصّٰفّٰت میں بھی ہے اور زیادہ تفصیل کے ساتھ سورہ الانبیاء میں ہے ـــــ البتہ بادشاہ وقت کے دربار میں جو پیشی ہوتی ہے، اس کا ذکر سورہ البقرہ میں ہے۔ فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ	"کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں
فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ	کیا جس نے ابراہیمؑ سے جھگڑا کیا تھا؟

اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ	جھگڑا اس بات پر کہ ابراہیمؑ کا رب کون
وَیُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ؕ	ہے اور اس بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے

حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیمؑ نے کہا کہ "میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے"۔ تو اس نے جواب دیا: زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے" (آیت ۲۵۸)

ایک عظیم شہنشاہ کے دربار میں پیشی ہے جو خدائی کا بھی مدعی ہے۔ ذرا چشم تصور سے دیکھئے کہ اس کے دربار کے کیا ٹھاٹ باٹ ہوں گے! کتنا بارعب ماحول ہوگا! عمائدین سلطنت ہاتھ باندھے صف در صف کھڑے ہوں گے۔ سب کی گردنیں خم اور نگاہیں نیچی ہوں گی۔ کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ شہنشاہ وقت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔ لیکن اس بارعب ماحول میں وہ نوجوان پوری طمانیت خاطر کے ساتھ پیش ہوتا ہے۔ اسے کوئی خوف نہیں، کوئی اندیشہ نہیں، کسی قسم کا کوئی ہراس نہیں اور وہ پوری دلیری کے ساتھ اس خدائی کے دعویدار شہنشاہ سے محاجہ کرتا ہے اور علی الاعلان کہتا ہے کہ "رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ" اس بیوقوف نے بحث میں الجھنے کی خاطر کہا کہ "اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ" "میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں"۔ یہ اختیار تو میرے ہاتھ میں بھی ہے ـــــ روایات میں آتا ہے کہ یہ کہنے کے بعد اس نے جیل سے دو قیدیوں کو بلایا۔ ایک کی گردن اڑا دی اور ایک کو آزاد کر دیا کہ جاؤ مزے کرو اور حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ تم نے دیکھا میرا اختیار! میں نے ایک کو مروا دیا اور ایک کو زندہ رکھا ـــــ اس کی اس کج بحثی کا رویہ دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ نے فوراً آخری حجت پیش کر دی اور کہا: قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ" (میرا) اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اگر تجھ میں خدائی کا کچھ اختیار ہے تو تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا" ـــــ اس حجت قاطعہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ: فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ "(یہ سن کر) وہ منکر حق ششدر ہو کر رہ گیا" ـــــ اس امتحان میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کامیاب ہو گئے ـــــ اب آیا ایک اور بڑا امتحان۔ یہ امتحان دنیا میں اکثر لوگوں کو پیش آتا رہتا ہے۔ نمرود نے جب اس محاجہ میں منہ کی کھائی تو اس نے طیش میں آ کر کہا کہ اب آخری فیصلہ کر لو۔ زندگی عزیز ہے تو اس مسلک کو اور اس دعوت توحید کو چھوڑنا ہوگا۔ اور اگر اسی مقصد پر ڈٹے رہو گے تو موت تمہارا مقدر ہوگی۔ ہمارے محاورے میں یوں کہہ لیجئے کہ تمہیں پھانسی کے پھندے کو چوم کر گلے میں ڈالنا ہوگا یا جیسے سقراط سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں زہر کا پیالہ پینا ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا

فیصلہ اس کے سوا کیا ہوتا کہ اپنے مؤقف سے سرمو ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ان کا مؤقف یہی رہا کہ: اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ زندگی جاتی ہے تو جائے توحید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا ــــ شہنشاہِ وقت کا حضرت ابراہیمؑ کی عزیمت کو دیکھ کر طیش اور غضب کا کیا حال ہوا ہوگا! اس کا آپ حضرات بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اور محاجہ میں اپنی شکست کی شرمساری سے بچنے اور اپنے عقائدین نیز عوام ان سب کے مطالبے پر حکم دیا کہ آگ کے ایک الاؤ میں اس کو جلا ڈالو اور اس طور پر اپنے معبودوں کی حمایت کرو اگر تم کو کچھ کرنا ہی ہے "قَالُوْا حَرِّقُوْہُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِھَتَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ۝ (الانبیاء) لہٰذا انہوں نے ایک بہت بڑا آگ کا الاؤ دھکایا اور حضرت ابراہیمؑ کو اس میں کود پڑنے کے لئے کہا گیا اور وہ کود گئے۔ اس کو بھی علامہ اقبال مرحوم نے بڑی خوبصورتی سے ادا کیا ہے وہ کہتے ہیں ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق! عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

دیکھئے یہاں بڑی پیاری بات آگئی ہے۔ عقل کا امتحان توحید باری تعالیٰ کی معرفت کے مرحلے میں تھا۔ اس موقع پر عقل کا امتحان تھا ــــ عقل تو ایسے مواقع پر یہ سمجھائے گی کہ جان بچاؤ۔ عقل تو ایسے حالات میں انسان کو مصلحتوں کا راستہ دکھاتی ہے۔ عربی زبان میں 'عقل' کہتے ہیں باندھنے کو۔ عربوں کے سر پر رومال جس چیز سے بندھا ہوتا ہے اسے 'عقال' کہا جاتا ہے اور یہ اسی لفظ 'عقل' سے بنا ہے۔ اصل میں یہ ماضی کے ایک دستور کی یادگار ہے۔ وہ دستور یہ تھا کہ عرب کے بدو کی کل کائنات اس کا اونٹ ہوا کرتا تھا۔ اسی پر چلنا ہے، اسی کا دودھ پی لینا ہے، اسی کا گوشت کھا لینا ہے۔ اسی کی کھال سے خیمے اور کمبل تیار کرتے ہیں اور اسی کے اون سے کچھ چیزیں تیار کر لیتے ہیں۔ ایسا بھی وقت آتا تھا کہ تق و دق صحرا میں اگر پانی دستیاب نہیں ہے تو اسی کا پیشاب پی لینا ہے۔ گویا ایک بدو کی پوری زندگی اونٹ کے گرد گھومتی تھی۔ لہٰذا اپنے اونٹ کو کہیں باندھنے کے لئے ہمیشہ اس کے پاس رسّی کا ایک ٹکڑا رہتا تھا کہ جہاں وہ اونٹ سے اترا اس نے رسّی کے ایک سرے سے اونٹ کا ایک گھٹنا باندھ دیا۔ وہ "عقال" کہلاتی تھی 'گھٹنا باندھنے والی چیز' ــــ اب اسی رسّی کو ہر وقت اپنے پاس رکھنا ہے تو اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ جب اونٹ کے گھٹنے سے رسّی کھولی تو اسے سر پر سجے ہوئے رومال پر لپیٹ لیا۔ اس طرح یہ ان کی ایک علامت اور ان کا ایک دستور بن

گیا۔ اور شعائر قومی میں سے ان کے لباس کا ایک جزو بن گیا ـــــ جیسے پٹھان آپ کو کوئی نہیں ملے گا جس کے کاندھے پر چادر نہ ہو ـــــ یہ چادر اس کے لباس کا جزو لازم بن گئی ہے۔ اسی طرح یہ عقال عربوں کے لباس کا ایک جزو لازم بن گیا ہے۔ یہ لفظ حدیث شریف میں بھی آتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب مسجد نبویؐ میں آئے اور باہر اونٹ کو چھوڑ دیا۔ اور آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آنحضرتؐ نے دریافت فرمایا کہ تم نے اونٹ کو باندھا نہیں تو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اللہ پر توکل کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً تعلیم فرمائی اَعْقِلْهَا ثُمَّ تَوَكَّلْ " پہلے اونٹ کو باندھو پھر اللہ پر توکل کرو" گویا اسلامی توکل یہ نہیں ہے کہ اسباب کو ترک کر دیا جائے۔ ہر کام کے لئے حتی الامکان اسباب جمع کرو۔ پھر اللہ پر توکل کرو کہ اصل میں ان اسباب سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہوگا وہی جو مسبب الاسباب یعنی اللہ چاہے گا ـــــ بہرحال عقل کے معنی کے بیان میں یہ جملہ ہائے معترضہ درمیان میں آگئے۔ میں جو کچھ عرض کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ جہاں تک جرات عملی کا تعلق ہے وہاں عقل ساتھ نہیں دیتی۔ وہاں جذبات کام دیتے ہیں۔ عقل تو روکتی ہے۔ وہ تو یہ راہ سجھاتی ہے کہ اس وقت جان بچاؤ۔ تاکہ مستقبل قریب میں مناسب وقت پر کلمہ خیر کہہ سکو ـــــ اس وقت کوئی توریہ کر لو۔ کسی ادھیلے سے جان بچاؤ۔ تم ختم ہو گئے تو یہ دعوت ہی ختم ہو جائے گی۔ پھر یہ کلمہ توحید اور کلمہ حق کہنے والا ہی کوئی نہیں رہے گا۔ تم یہاں سے جان بچا لو گے تو باہر جا کر کوئی شکل پیدا کر سکو گے۔ البتہ راہ کے تعین میں عمل دخل ہوتی ہے۔ یہ کام جذبات کے حوالے کیا گیا تو معاملہ غلط ہو جائے گا۔ ان میں توازن ضروری ہے۔ عقل سے روشنی حاصل کرو۔ جانا کدھر ہے، مقصد کا تعین اور رخ کا تعین تو عقل صحیح کرے گی۔ جذبات غلط رُخ پر ڈال دیں گے۔ لیکن جب راہ کا تعین ہو گیا کہ جانا کدھر ہے تو چلنے کے اب عقل کو ایک طرف رکھنا ہوگا۔ اب جذبات ہوں گے جو آگے لے کر چلیں گے۔ پھر یہ جذبات ہی اس راہ کی مشکلات، موانع، تکالیف، شدائد اور مصائب سے ـــــ نبرد آزما ہوں گے۔ عقل ان سے نبرد آزما نہیں ہو سکتی۔ یہاں عشق اور جذبات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے بغیر ایک قدم بھی آگے بڑھنا مشکل ہے۔ وہی ان تمام سے نبرد آزما ہو سکتا ہے۔ پس عقل سے روشنی حاصل کرو اور جذبات کے تحت حرکت کرو۔ یہ توازن از بس ضروری ہے۔ اور یہی توازن ہے جو اکثر لوگوں کو نصیب نہیں ہوتا۔ جیسے عقل عام (Common Sense) جس کو کہا جاتا ہے وہ ہی Rare

Sense ہے۔ یہ Sense کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ جس سے واقعتاً وہ کسی معاملے اور واقعے کہ تہہ تک پہنچ سکتے ہیں۔

بہرحال ان لوگوں نے آگ کا ایک الاؤ تیار کیا اور حضرت ابراہیمؑ کو اس میں جھونک دیا۔ سورہ الانبیاء کے علاوہ اس واقعے کا سورہ الصّٰفّٰت کی آیات ۹۷ یا ۹۸ میں بھی ذکر موجود ہے۔ وہاں یہ حال ہے بقول جگر مراد آبادی لہ

لالہ و شوراش دل میں جو ہیں تیرے دیکھنے والے
سر مقتل بھی دیکھیں گے چمن اندر چمن ساقی!

سورہ الانبیاء میں ذکر ہے کہ "ہم نے کہا، اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیمؑ پر": قُلْنَا يٰنَارُ كُونِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝ " اور وہ (نمرود اور اس کی قوم کے لوگ) ابراہیم کے ساتھ بُرائی کرنا چاہتے تھے۔ مگر ہم نے ان کو بُری طرح ناکام کر دیا" ـــــ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ۝ ـــــ اور وہ آگ حضرت ابراہیمؑ کے حق میں گل و گلزار بن گئی۔ وہ اللہ کا بندہ اس امتحان میں بھی کامیاب ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو معجزانہ طریقے پر بچا لیا ـــــ اس کے بعد یہ جان لیجئے کہ انبیاء و رسل کے باب میں اللہ کی سنت یہ ہے، اس کا قانون یہ ہے کہ جب کسی ملک یا معاشرے کے لوگ نبی کی جان لینے کے درپے ہو جائیں اور اس پر ہاتھ ڈال دیں تو گویا یہ معاشرہ اس طرح یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اس کے اندر حق کے قبول کرنے کا کوئی جوہر باقی نہیں ہے۔ وہ اپنی محرومیت پر مہر تصدیق ثبت کر چکا ہے تو یہ وقت ہوتا ہے جب ہجرت کا مرحلہ آتا ہے اور نبی یا رسول کو حکم ہوتا ہے کہ اب یہاں سے ہجرت کر دو اور کہیں اور جاؤ۔ چنانچہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا دار الندوہ میں فیصلہ ہو گیا تو مشرکین مکہ کا یہ فیصلہ ہجرت کی تمہید بن گیا ـــــ

آگ کے الاؤ سے بچنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے کہا:۔

وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۝ (الصّٰفّٰت)

"اور ابراہیم نے کہا کہ میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں، وہ ہی میری رہنمائی کرے گا"

یعنی میں اپنے رب کی خاطر گھر بار اور وطن چھوڑ رہا ہوں۔ رہا یہ معاملہ کہ میرا آئندہ ٹھکانہ کہاں ہوگا تو اس کو میں اسی کے حوالے کرتا ہوں وہ میری رہنمائی کرے گا ـــــ یہ ہوا پانچواں امتحان وطن کو خیرباد کہنا اور صرف اللہ کے بھروسے پر وہاں سے نکل جانا۔ کوئی منزل پیش نظر نہیں،

کوئی منصوبہ بندی نہیں۔ توکل ہے تو یہ کہ "سَیَھْدِیْنِ" میرا رب جلد ہی میری رہنمائی فرمائے گا ـــــ یہ آج سے چار یا ساڑھے چار ہزار سال قبل کی بات ہے۔ لہٰذا اس کو آج کے زمانے اور اپنے دور پر قیاس نہ کیجئے گا۔ اس زمانے میں اپنے وطن کو خیرباد کہنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس وقت انسان کو جغرافیے کا کتنا علم ہوگا اور اس کی کتنی معلومات ہوں گی کہ میرے ملک کے علاوہ کون کون سے قریبی ممالک ہیں اور ان کے باشندوں کی مذہبی و معاشرتی کیفیات کیا ہیں!! یہ نہیں تھا کہ یہاں بیٹھے آپ کے پاس امریکہ کے بڑے شہروں کے ہوٹلوں کے نام اور فون نمبر تک موجود ہیں۔ اور آپ یہاں سے باقاعدہ پیشگی بکنگ کرا کے جا رہے ہیں۔ اس معنی میں اس وقت انتہائی Uncertainity تھی۔ توکل و اعتماد تھا تو صرف اپنے رب پر۔ قَالَ اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ۔ یعنی کہ میں اپنے رب کی خاطر اسی کی طرف جا رہا ہوں۔ لہٰذا وہی میری رہنمائی کرے گا۔ اور مجھے کوئی ٹھکانہ عطا فرمائے گا۔ یہ ہجرت خالص اِلی اللہ تھی۔ وہ جو حدیث آتی ہے کہ: فَمَنْ کَانَ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ اس وقت بظاہر تو ہجرت ہو رہی تھی مدینہ کی طرف لیکن اصل میں تو یہ ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف تھی ـــ وہاں منزل کا پتہ تو تھا لیکن یہاں تو کچھ معلوم نہیں تھا کہ منزل کونسی ہوگی۔ لہٰذا میرے خیال میں حضرت ابراہیم علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ ہجرت، ہجرت اِلی اللہ کی اکمل ترین نظیر ہے۔ اس ہجرت میں ان کے ساتھ ان کی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ اور ان کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام تھے۔ یہ دونوں آپ پر ایمان لا چکے تھے۔ حضرت لوط کو بعد میں سدوم کی بستی کی طرف توحید اور رشد و ہدایت کے لئے مامور فرما کر بھیج دیا تھا ـــــ اسی دوران مصر کا سفر اختیار کیا جہاں کے بادشاہ نے ایک شہزادی حضرت ہاجرہ آپ کو ہدیہ میں دی۔ میں ان تفاصیل کو چھوڑ کر آگے چلتا ہوں

اس ہجرت کی زندگی میں احساس ہوا کہ چند اعوان و انصار ہوں، چند لوگ بطور دست و بازو ہوں تو زبان پر دعا آتی ہے کہ:-

رَبِّ ھَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝	"اے میرے رب مجھے ساتھی عطا فرما جو
(الصّٰفّٰت)	صالحین یعنی نیکوکاروں میں سے ہو"۔

یہ حوصلہ نہیں ہوا کہ صاف صاف بیٹے کے لئے دعا کرتے ـــــ لیکن دعا قبول ہوتی ہے اور اس بوڑھے موحد کو ستاسی سال کی عمر میں حضرت اسماعیل علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام

جیسا بیٹا حضرت ہاجرہ کے بطن سے عطا ہوتا ہے۔ آپ کی پہلی اہلیہ حضرت سارہ جو آپ ہی کے خاندان سے تھیں اور جنہوں نے ہجرت میں آپ کا ساتھ دیا تھا بانجھ تھیں۔ ان کو حضرت اسمٰعیلؑ کی پیدائش کے بعد جب فرشتوں کے ذریعے حضرت اسحٰق علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیدائش کی بشارت دی گئی تو انہوں نے اپنا آپا پیٹ لیا تھا۔ اس کا ذکر سورہ ہود میں آیا ہے:

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ۭ اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ۝ (۷۲)

"حضرت سارہ نے کہا ہائے میری بدبختی میں بوڑھی پھونس اور بانجھ کیا اس عمر میں میرے یہاں اولاد ہوگی۔! جبکہ میرے شوہر بھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ یہ تو بڑی انوکھی بات ہے"

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرت سارہ کا اللہ کی قدرت پر ایمان نہیں تھا یا وہ واقعی اولاد کی خوشخبری کو بدبختی سمجھتی تھیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان ہونی خبر پر بربنائے طبع بشری ایک عورت کے جو جذبات و احساسات ہو سکتے ہیں، وہ بے اختیار ان کی زبان پر آگئے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے بعد کی پوری زندگی مسلسل مسافرت و مہاجرت کی داستان ہے۔ آج شام میں ہیں تو کل مصر میں پرسوں اردن یا فلسطین میں۔ پھر حجاز کا بھی دورہ ہو رہا ہے۔ فکر ہے تو یہی کہ کلمہ توحید سربلند ہو اور اس دعوت کا جابجا مراکز قائم ہو جائیں ـــــ جب کہولت کے آثار کچھ زیادہ طاری ہوتے محسوس ہوئے تو یہ دعا زبان پر آئی کہ رَبِّ هَبْ لِىْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ اس کا جواب ملتا ہے: فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ (الصّٰفّٰت) اللہ کی قدرت اور دین ہے، جس کو جو چاہے دے دے۔ چنانچہ اس بڑھاپے میں حضرت ابراہیمؑ کو ایک بردبار اور حلیم بیٹے اسمٰعیل کی پیدائش کی خوشخبری دی جاتی ہے اور بعد میں حضرت اسحٰق کی ولادت کی تو یہ بندۂ حنیف اللہ کے اس فضل و کرم پر بایں الفاظ شکر ادا کرتا ہے کہ:-

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ وَهَبَ لِىْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ

ابراہیمؑ نے کہا" اس اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے بڑھاپے کے باوجود اسماعیل اور اسحاق جیسے وارث عطا فرمائے"

جوانی کا دور ہوتا اور بیٹے ہو گئے ہوتے تو یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ عام عادی قانون یہی ہے۔ اس کا بھی شکر ایک مسلمان پر واجب ہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہے عَلَی الْکِبَرِ کا۔ دعا کی اس مقبولیت پر دل کی گہرائیوں سے ترانہ شکر ادا ہونے کا۔ اسی لئے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ:

اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ ۝ "بلاشبہ میرا رب دعا ضرور سنتا ہے"۔

اب سورۃ الصّٰفّٰت میں از آیت ۱۰۰ تا آیت ۱۱۱ میں چھٹے اور آخری امتحان کا ذکر شروع ہوتا ہے اور نہایت مختصر لیکن جامع ترین الفاظ میں صورتِ حال کی ایک ایسی مکمل تصویر کھینچ دی جاتی ہے کہ ہم چشمِ تصور سے پورے واقعے کو ہر دور اور ہر زمانے میں دیکھ سکتے ہیں۔ پہلے یہ آیات اور ان کا ترجمہ سن لیجئے۔ پھر مختصر وقت رہ گیا ہے اس میں، میں ان کی تشریح کی کوشش کروں گا۔

رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی قَالَ یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ ۝ وَنَادَیْنٰهُ اَنْ یّٰٓاِبْرٰهِیْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ۝ وَفَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ ۝ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

"اے پروردگار، مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحوں میں سے ہو"۔ (اس دعا کے جواب میں) ہم نے اس کو ایک حلیم (بردبار) لڑکے کی بشارت دی۔ وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیمؑ نے اس سے کہا، بیٹا، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں، اب تو بتا، تیرا کیا خیال ہے؟" اس نے کہا، "ابا جان جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالئے، آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے"۔ آخر کو جب انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا۔ اور ہم نے ندا دی کہ "اے ابراہیم، تو

نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیدیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی:

اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دیکر اس بچے کو چھڑا لیا۔ اور اس (قربانی کو بطور یادگار ہمیشہ کے لئے) بعد کی نسلوں کے لئے چھوڑ دیا ـــــ سلام ہے ابراہیم پہ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔

دعائیں کر کر کے تو اللہ سے بیٹا لیا اور وہ بھی کیسا بیٹا! حلیم۔ نہایت بردبار، سلیم الطبع، فرماں بردار، صابر اور سعادت مند ـــــ لیکن اب آخری امتحان کے لئے اسٹیج سیٹ ہو رہا ہے۔ گویا قدرت مسکرا رہی ہے کہ ایک سو سالہ بوڑھے انسان کا امتحان، بڑا کڑا امتحان ابھی باقی ہے۔ یہ بڑے بڑے امتحانوں سے گذر کر آیا ہے لیکن ابھی آخری تیر ایک بھاری اور مشکل امتحان کی صورت میں ہمارے ترکش میں موجود ہے ـــــ امتحان کی گھڑی دیکھئے: فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ "تو جب وہ (بیٹا) اس (باپ) کے ساتھ بھاگ دوڑ کرنے کے قابل ہوا"۔ تو اس امتحان کا وقت بھی آپہنچا۔ بچہ جب بالکل baby ہوتا ہے۔ بالکل چھوٹا سا ہوتا تو قدرے ہلکا امتحان ہوتا۔ لیکن اب تو کڑی سے کڑی آزمائش مطلوب ہے۔ ادھر بوڑھا باپ اپنے اکلوتے بیٹے کو جوان ہوتے دیکھ رہا ہے اور جی رہا ہے ادھر محبت و جذبات اور امیدوں اور تمناؤں کے امتحان کا مرحلہ آگیا ـــــ اور اس کے لئے وقت منتخب کیا گیا جب زندگی کی بھاگ دوڑ میں وہ بوڑھے باپ کے ہاتھ کی لاٹھی بننے کے قابل ہو گیا۔ چنانچہ فرمایا: فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ۔ جد و جہد اور محنت و مشقت میں ہاتھ بٹانے والا بن گیا جس کو ہم کہیں گے کہ فی الحقیقت دست و بازو بن گیا ـــــ اس وقت حضرت اسمٰعیلؑ کی تیرہ سال کی عمر تھی ـــــ تو حضرت ابراہیمؑ اس سے کہتے ہیں قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى "اے میرے پیارے بچے! میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ (روایات میں آتا ہے کہ مسلسل تین دن تک یہ خواب آیا ہے) اب تم دیکھو، غور کرو اور بتاؤ کہ تمہاری رائے کیا ہے"۔ بیٹے کی رائے معلوم کر کے باپ بھی بیٹے کا امتحان لے رہا ہے ـــــ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے ـــــ سچا خواب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ جس کی

علیہ وسلم پر تا قیام قیامت بند ہو گیا۔ لیکن اس سے کم تر کچھ چیزیں اب بھی باقی ہیں۔ الہام اب بھی ہے۔ کشف اب بھی ہے، القا اب بھی ہے۔ اللہ اپنے جس بندے کے دل میں جو بات چاہے ڈال دے۔ اس کے لئے نبی ہونا شرط نہیں ہے۔ نبی ہونا خواتین کے لئے ہے ہی نہیں لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں بات ڈالی اور کتنے یقین کے ساتھ ڈالی کہ اپنے بچّے کو خود اپنے ہاتھوں صندوق میں بند کر کے دریا کے حوالے کر دینا آسان کام نہیں تھا۔ جب تک یہ یقین نہ ہوتا کہ بات مجھ پر القا ہوئی ہے۔ اگر ذرا بھی گمان ہوتا کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے تو وہ یہ اقدام کر سکتی تھیں! پس الہام، القا اور کشف اور رویائے صادقہ یہ ساری چیزیں اب بھی ہیں۔ یہ چیزیں نبیوں کے لئے بھی تھیں اور غیر نبیوں کے لئے بھی ـــ خود نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ وحیٔ نبوّت کا دروازہ مجھ پر بند ہو گیا لیکن رویائے صادقہ کا سلسلہ جاری رہے گا جو نبوّت کا چھیالیسواں حصّہ ہے۔ ایک روایت میں سوال حصّہ بھی آیا ہے۔ البتہ نبیوں کے لئے یہ چیزیں یعنی الہام، القا، کشف اور رویا (خواب) بھی وحی کے درجے میں ہوتے ہیں۔ اور ان میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ فوراً یقین کر لیتے ہیں کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔

اب بیٹے کی حلیمی کا اظہار ہو رہا ہے: قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ " اس بیٹے نے کہا، اباجان! کر گزریئے جو حکم آپ کو مل رہا ہے۔ آپ ان شاء اللہ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔" فَلَمَّآ اَسْلَمَا " تو جب وہ دونوں مسلمان ہو گئے" یہاں میں نے جان بوجھ کر "مسلمان ہو گئے" ترجمہ کیا ہے۔ اسلام یہی ہے۔ جس کو ہم نے بدنام کیا ہوا ہے "اسلام" کے اصل معنی ہیں گردن نہادن، سرِ تسلیم خم کر دینا۔ جو بھی اللہ کا حکم ہے اس کی بلا چون و چرا اطاعت اور فرمانبرداری کرنا "اسلام" ہے۔ بقول مولانا محمد علی جوہر مرحوم ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے — لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اور بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

چوں می گویم مسلمانم، بلرزم — کہ دانم مشکلاتِ لا اِلٰہ را

گردن جھکا دی، جب دونوں نے اللہ کے حکم کو بسروچشم قبول کر لیا۔ وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ "اور اس (ابراہیمؑ) نے اسے (اسمٰعیلؑ) کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا" تاکہ چہرہ سامنے نہ رہے اور جذبات فطری عین وقت پر جوش میں نہ آجائیں۔ بوڑھے ہاتھوں میں کہیں لرزش پیدا نہ ہو جائے۔ سو برس کا بوڑھا ہے جو اپنے تیرہ برس کے اکلوتے بیٹے کے گلے پر چھری پھیرنے کی تیاری کر رہا ہے ــــ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۝ "اور ہم نے اس کو پکارا اے ابراہیم!" (بس کر) قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا "بلاشبہ تو نے خواب کو سچ کر دکھایا" اس سے زائد ہمیں بھی درکار نہیں) یعنی ممتحن کو بس کرنا پڑی، جس کا امتحان لیا جا رہا تھا اس نے بس نہیں کی، چشم فلک اس نظارے کی تاب نہیں لا سکی کہ ابراہیمؑ بیٹے کو بالفعل ذبح کر رہا ہے۔ امتحان پورا ہو گیا، تم آمادہ ہو گئے اور اپنی محبوب ترین شے کو اللہ کی محبت و اطاعت کی خاطر اور اس کی راہ میں قربان کرنے کے لئے جی جان سے تیار ہو گئے، لہٰذا امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ تمہاری کامیابی تسلیم ــــ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ "ہم اس طرح ان لوگوں کو جو محسن ہوتے ہیں، جو درجۂ احسان پر فائز ہو جاتے ہیں، ان کو اپنے انعامات اور جزا سے نوازتے ہیں" ــــ محسن، احسان کرنے والے نہیں۔ ایک احسان دوسروں پر ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ مفہوم اردو میں مستعمل ہے۔ عربی میں احسان کا یہ مفہوم بھی ہے لیکن اس کا اصل اور حقیقی مطلب (یعنی کسی کام کو نہایت خوبصورتی سے کرنا ہے۔ اسلام میں جب احسان پیدا ہو جائے گا تو وہ احسان ہو جائے گا۔ حدیث جبرائیل میں اسی لئے یہ تین مراتب بیان ہوئے ہیں ــــ اَخْبِرْنِيْ عَنِ الاسلام، اَخْبِرْنِيْ عَنِ الایمان اور اَخْبِرْنِيْ عَنِ الاحسان ــــ یہ بتائیے اسلام کسے کہتے ہیں! یہ بتائیے کہ ایمان کسے کہتے ہیں! یہ بتائیے کہ احسان کسے کہتے ہیں! تو احسان سے ہمارے دین میں بہترین اعمال کی ارفع و اعلیٰ ترین سطح کو کہا جاتا ہے۔ لہٰذا فرمایا: اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ "اسی طرح ہم نیکوکاروں اور خوب کاروں کو جزا دیتے ہیں" آگے فرمایا: اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝ "واقعہ یہ ہے کہ یہ بڑا کھلا امتحان تھا۔ بہت کڑی آزمائش تھی" ــــ اب آپ خود ہی سوچئے کہ اس سے بڑا کامیابی کا درجہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ خود ممتحن پکار اٹھے کہ امتحان واقعی بہت کڑا، بہت مشکل اور بہت کٹھن تھا۔ اب معاملہ رہ کیا گیا تھا۔ چھری تو پھیر ہی دی تھی۔ لیکن اس نے حکم الٰہی سے کام کیا نہیں ــــ اب آگے بڑھتے

ہوا یہ سو سال کا بوڑھا اس آخری اور کڑے امتحان تک پہنچا ہے۔ والدین اور گھر بار کو اس نے چھوڑا اللہ کے لئے۔ قوم سے اس نے منہ موڑا اللہ کی توحید کے لئے۔ شہنشاہ اور اقتدار وقت سے وہ جا ٹکرایا' اللہ کی توحید کے لئے۔ اپنی جان دینے پر وہ آمادہ ہو گیا' اللہ کی توحید کے لئے۔ وطن کو اس نے خیرباد کیا' اللہ کی توحید کے لئے ـــــ اپنے اکلوتے تیرہ سالہ نوعمر بیٹے کو وہ ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گیا حکم الٰہی کی تعمیل میں ـــــ یہ آخری امتحان تھا۔ سب سے کڑا' سب سے مشکل ـــــ اس کے نتیجے میں ہوا یہ کہ: وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ۝ "اور ہم نے اس (اسمٰعیل) کو چھڑایا ایک عظیم قربانی دے کر" ـــ یعنی حضرت اسمٰعیلؑ کی جگہ ان کے بدلے میں ایک بڑی قربانی دے کر خود اللہ تعالیٰ نے اس کو چھڑایا ـــ یہ ذبح عظیم کیا تھا؟ اس کے متعلق روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنت کا ایک مینڈھا تھا۔ قرآن مجید میں جس بات کو مجمل چھوڑ دیا گیا ہو تو اس کی تفصیل کے لئے ہمیں جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرنا ہوگا چونکہ تبیین قرآن آپؐ کا فرض منصبی ہے۔ بفحوائے آیت قرآنی:

وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ	"(اے محمدؐ) ہم نے یہ ذکر (قرآن مجید)
لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ	تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے

اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لئے اتاری گئی ہے"

تو حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کا وہ مینڈھا حضرت اسمٰعیلؑ کی جگہ ذبح ہوا۔ اس کو ذبح عظیم اس اعتبار سے کہا گیا کہ جنت کا وہ مینڈھا زمین پر لا کر ذبح کیا گیا۔ اب اس ذبح عظیم کا سلسلہ ہے جو عید الاضحیٰ کے موقع پر ہر سال لاکھوں جانوروں کی قربانی کی شکل میں تواتر سے چلا آ رہا ہے۔ وہ یاد ہزاروں سال سے منائی جا رہی ہے۔ وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ۝ یہ جو جانور ہزاروں سال سے عید الاضحیٰ کے موقع پر ذبح ہوتے ہیں۔ یہ ایک اعتبار سے حضرت اسمٰعیل علیہا الصلوٰۃ والسلام کا فدیہ ہیں اور دوسرے اعتبار سے ان کا مفاد یہ ہے کہ امت مسلمہ کے ہر فرد کے دل میں یہ جذبہ ہر سال تازہ ہوتا رہے کہ وہ متاع دنیا کی محبوب ترین شے بھی اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار رہیں۔ چنانچہ فرمایا:

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ۝	"اور ہم نے بعد کی نسلوں کے لئے اس (قربانی کو بطور یادگار) چھوڑ دیا"
سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ۝ كَذَٰلِكَ نَجْزِي	"سلامتی ہو ابراہیم پر (جو اس کڑے

الْمُحْسِنِيْنَ ۝ — استحان میں پورا اترا) اور اسی طرح ہم محسنوں کی قدر دانی کرتے ہیں اور ان کو جزا سے نوازتے ہیں۔"

ابراہیمؑ کی اس قربانی کے جذبے کی یادگار ہم نے آنے والوں کے لئے قائم کر دی ــــ آپ غور کریں کہ ابراہیم علیہ السلام پر سلام بھیجنے والوں کی اس وقت دنیا میں دو تہائی تعداد ہے۔ یہودی ہوں عیسائی ہوں وہ سب حضرت ابراہیمؑ کی تعظیم کرتے اور ان پر سلام بھیجنے والے ہیں اور ان کے نام لیوا ہیں۔ رہے مسلمان، تو وہ احق ہیں:

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ	"ابراہیم سے صحیح اور قریب ترین رشتہ
اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ	اور نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق
اٰمَنُوْا ۗ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝	اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا
(آل عمران)	ہے جنہوں نے ان کی پیروی کی اور اب

یہ نبیؐ اور اس پر ایمان لانے والے۔ اللہ صرف ان کا دوست ہے جو ایمان رکھتے ہوں۔"

پھر دیکھئے کہ ہر نماز میں آپ جو درود پڑھتے ہیں اس میں حضرت ابراہیمؑ پر بھی درود بھیجا جاتا ہے اسی لئے یہ درود ابراہیمی کہلاتا ہے ــــ آگے حضرت ابراہیمؑ کی مدح میں فرمایا:

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝	"یقیناً وہ (یعنی ابراہیمؑ) ہمارے مومن
	بندوں میں سے تھے۔"

اب یہاں تین الفاظ نوٹ کر لیجئے "پہلا اسلام" فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ــــ یہ اسلام ہے اسی اسلام کا حضرت ابراہیمؑ کے بیان کے ضمن میں سورہ البقرہ کی آیت نمبر ۱۳۱ میں ذکر ہے:۔ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ "ابراہیمؑ کا یہ حال تھا کہ جب اس کے رب نے یہ اس سے کہا "مسلم ہو جا" تو اس نے فوراً کہا "میں رب کائنات کا "مسلم" ہو گیا" ــــ حضرت ابراہیمؑ کی اسی کیفیت تسلیم کو سورہ الصّٰفّٰت کی آیت ۸۴ میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ: اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝ ــــ ان کے مسلم ہونے کی اللہ خود ہی سند عطا فرما رہے ہیں۔

ــــ "دوسرا ایمان" ــــ اب اللہ تعالیٰ کسی کو "مومن" مان لے تو گویا اس نے کی طرف سے اسے ایک بہت بڑا سرٹیفکیٹ دے دیا گیا۔ چنانچہ فرمایا: اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ــــ اب ذرا اسلام اور ایمان کی ان دو کسوٹیوں پر اپنے اسلام اور ایمان کو پرکھئے کہ ہم ان اعتبارات سے کس مقام پر کھڑے ہیں! ہم کتنے پانی میں ہیں!! اللہ کی راہ میں اپنی محبوب ترین

چیز کو عملاً قربان کرنے پر آمادہ ہو جانا۔ زبانی کلامی نہیں ۔۔۔ تو یہ ہے درجہ احسان ۔۔۔ اسلام
ایمان اور احسان تینوں کی حقیقتیں اس ایک واقعہ سے ہمارے سامنے آگئیں ۔۔۔
ان ہی امتحانات سے گذرنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ اس مرتبے کو پہنچے کہ ان کو امام الناس
کے مقام پر فائز کیا گیا اور ان کو خلّتِ الٰہی سے نوازا گیا: وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرٰھِیْمَ خَلِیْلًا ۝

اب ایک اور بات جان لیجئے کہ حج کا یہ جو پورا سلسلہ ہے، یہ درحقیقت ایک فرض
عبادت ہے ہر زادِ راہ رکھنے والے مستطیع مسلمان پر بعنوانِ آیت ذیل:

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ	"اور لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو (اللہ
اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا ؕ	کے گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو،
(آل عمران)	وہ اس کا حج کرے۔"

پھر حج میں جو مناسک ادا کئے جاتے ہیں ان کو شعائر قرار دیا گیا ہے ۔۔۔ سورہ بقرہ میں فرمایا: اِنَّ
الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِھِمَا ؕ ۔۔۔
سورۂ حج میں فرمایا کہ قربانی کے جانور بھی شعائر اللہ میں سے ہیں: وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰھَا لَکُمْ مِّنْ
شَعَآئِرِ اللّٰہِ ۔۔۔ بیت اللہ اس زمین اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا شعیرہ ہے۔ شعائر کے
مجازی معنی ہیں "وہ چیزیں جن کے ادب و احترام کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے حکم دیا ہے"۔
اس کے ایک مجازی معنی نشانی و علامت کے بھی آتے ہیں۔ حج کے یہ سب شعائر کیا ہیں۔!
دراصل یہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کے مختلف مراحل ہیں۔ یہ اسی داستانِ عزیمت
وامتحان کے مختلف ابواب اور ان کے اوراق ہیں۔ جن کی ہر سال یاد منائی جاتی ہے۔ یہ بین
الصفا والمروہ سعی ہو رہی ہے۔ یہ حضرت اسمٰعیلؑ کی والدہ حضرت ہاجرہ سلام اللہ علیہا کی اس
عالم بیتابی کی نشانی ہے جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو وادیٔ غیر ذی زرع میں چھوڑ کر چلے
گئے تھے اور وہ ننھی سی جان اسمٰعیلؑ پیاس سے تڑپ رہی تھی اور حضرت ہاجرہ پانی کی تلاش
میں صفا اور مروہ کے درمیان سات مرتبہ دوڑی تھیں اور ہر جگہ میں پہاڑی پر چڑھ کر پانی
ڈھونڈنے کے لئے چاروں طرف نگاہیں دوڑائی تھیں ۔۔۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی اس مومنہ
بندی کی یہ ادا اتنی بھائی کہ حج اور عمرہ کرنے والوں کے لئے مسعیٰ میں دوڑنے کو شعائر اللہ
میں سے قرار دے دیا۔ یہ اس لئے بھی ہوا کہ یہ حضرت ہاجرہ کے اللہ پر توکل اور صبر کی
بھی ایک عظیم الشان نشانی ہے چونکہ جب حضرت ابراہیمؑ اس لق و دق صحرا کی ...

میں ان کو اور شیر خوار بچے کو چھوڑ کر جا رہے تھے تو حضرت ہاجرہ نے ان سے دریافت کیا تھا کہ آپ ہم کو کس کے حوالے کر کے جا رہے ہیں تو حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا تھا کہ اللہ کے حوالے۔ جس پر حضرت ہاجرہ نے کہا تھا۔ یہ صورت حال ہے تو میں راضی ہوں۔ آپ تشریف لے جائیے۔ حضرت اسمٰعیل کی بے چینی کے عالم میں ایڑیاں رگڑنے سے معجزانہ طور پر چاہ زم زم کا ظہور ہوا جس سے چار ہزار سال گزرنے کے بھی آج بھی لاکھوں بندگانِ خدا سیراب ہوتے ہیں۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ہی امتحان سے نہیں گزرے بی بی ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ بھی نوعمری میں ہی امتحان سے گذرے ہیں۔ گویا ایں خانہ ہمہ آفتاب است والا معاملہ ہوا ہے ـــــ ع "جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے"۔ اس لئے سب سے زیادہ کٹھن امتحان سے تو حضرت ابراہیم گزرے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جن کا رتبہ بلند سے بلند تر ہوگا اُسی مناسبت سے ان کو آزمائشوں سے واسطہ بھی پڑے گا۔ جیسے جو پرائمری کا امتحان پاس کرلے اسے ہی مڈل پھر آگے کے امتحانات سے گزرنا ہوگا۔ جو پرائمری میں فیل ہو جائے، اس کے لئے اگلے امتحانات کا کیا سوال! اگلے امتحان کا موقع تو بتدریج آتا ہے ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!

ـــــ چنانچہ حج اور عید الاضحیٰ یہ دو اسلامی عبادات اور شعار دونوں حضرت ابراہیمؑ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شخصیت کے گرد گھومتے ہیں جن کی تعظیم و تکریم کرۂ ارض کے بسنے والوں کی دو تہائی آبادی کرتی ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے۔

حج کا رکن رکین تو وقوف عرفات ہے ـــــ اس کے علاوہ سورۂ الحج میں دو بنیادی ارکان کا ذکر ملتا ہے۔ ایک اللہ کے نام پر جانوروں کی قربانی اور دوسرے طواف بیت اللہ کا۔ اور ان میں بھی زیادہ زور اور تکرار و اصرار قربانی پر ہے ـــــ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ حج ارکانِ اسلام میں سے جامع ترین رکن ہے۔ لیکن اس کا معاملہ یہ ہے کہ یہ ایک خاص مقام اور جگہ سے متعلق ہے۔ حج آپ کسی دوسرے مقام پر کر ہی نہیں سکتے۔ اس کی ادائیگی کے لئے تو آپ کو مقررہ تاریخوں اور دنوں میں ارض مقدس جانا پڑے گا اور اس میں

ہے ___ تو مَالَا یُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا یُتْرَكُ كُلُّهٗ یہ ایک اصول ہے۔ عقل عام (Common Sense) کے تحت یہ کہا جاتا ہے کہ جو چیز کُل کی کُل حاصل نہ ہو جا سکتی ہو تو کُل کی کُل کو چھوڑ دینی بھی نہیں چاہیئے۔ اس میں سے جو کچھ بھی ملتا ہو وہ تو لو۔ بس اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ حج کے ارکان میں سے ایک رکن قربانی ہے۔ گویا بلاشبہ عیدالاضحیٰ اور اس کے ساتھ "قربانی" حج ہی کی توسیع کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ حج اس اعتبار سے ایک محدودیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اس کے تمام مراسم و مناسک ایک متعین علاقے یعنی مکہ مکرمہ اور اس کے نواح ہی میں ادا کئے جاتے ہیں اور کئے جا سکتے ہیں۔ اسی لئے اس کے ایک رکن یعنی اللہ کے نام پر جانوروں کی قربانی کو وسعت دے دی گئی ہے تاکہ اس روئے زمین پر بسنے والا ہر مسلمان اس میں شریک ہو جائے اور یہی عیدالاضحیٰ اور اس کے ساتھ قربانی کی اصل حکمت ___

لہٰذا واجب ہے کہ ہر مستطیع عیدالاضحیٰ پر قربانی کرے۔ وہ بیت اللہ کا طواف نہیں کر پا رہا۔ وہ سعی بین الصفا والمروہ نہیں کر پا رہا۔ وہ منیٰ میں قیام نہیں کر سکتا۔ وہ وقوف عرفہ سے محروم ہے۔ وہ ان تمام برکات سے تہی دست رہ گیا ہے تو اس میں ایک حصّہ ایسا ہے کہ جو مقام و مکان کی قید سے آزاد ہے اس لئے وہ پورے کرۂ ارضی کے تمام مسلمان میں بانٹ دیا گیا ہے۔ سب کو اس میں شریک کر لیا گیا ہے وہ ہے نماز عیدالاضحیٰ اور اس کے ساتھ جانوروں کی قربانی۔ تاکہ دنیا بھر کے مسلمان اس کام میں شریک ہو جائیں ___ ایک بات نوٹ کر لیجئے کہ شریعت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام سے قبل ارکان حج میں سے بہت بڑا رکن یہ قربانی ہی تھا۔ مثلاً سورہ الحج میں، جس کا اکثر و بیشتر حصّہ مکی ہے۔ اس کا کچھ حصّہ دوران سفر ہجرت میں نازل ہوا ہے۔ حج کے احکام کا جو ذکر آتا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں سب سے زیادہ زور طواف اور قربانی پر ہے۔ لیکن سورۂ البقرہ میں حج کے ارکان کا جو بیان آیا ہے اس میں قیام منیٰ، وقوف عرفات، قیام مزدلفہ اور وہاں ذکر الٰہی کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے اور وہاں قربانی کا ذکر نہیں ہے۔ آپ کو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوگی۔ اصل بات سمجھئے وہ یہ کہ شریعتِ محمدیؐ میں حج کے ساتھ قربانی کی اہمیت [illegible]

تھی۔ یہ باہر سے جانے والے جو قربانی دیتے ہیں یہ "تمتع" کی قربانی دیتے ہیں۔ کیونکہ ایک ہی سفر میں وہ عمرہ بھی کر رہے ہوتے ہیں اور حج بھی۔ "تمتع" اسی کو کہتے ہیں یہ اس تمتع کا شکرانہ ہے جو ہر شخص قربانی کی شکل میں کر رہا ہے۔ وہاں کا (یعنی عرب کا) جو مفرد حاجی ہے، اس پر قربانی واجب نہیں ہے۔ لیکن یہ قربانی پوری دنیا میں عام کر دی گئی ہے ـــــ اب ہمارے ہاں جو منکرین حدیث ہیں ان کی عقل بالکل الٹی ہے، ان کی مت ماری گئی ہے لہٰذا غلط استدلال کرتے ہیں۔ وہ وہاں کی قربانی کے تو قائل ہیں، یہاں کی قربانی کے قائل نہیں ہیں۔ دلیل یہ دیتے ہیں کہ یہاں قربانی کا گوشت ضائع ہوتا ہے۔ حالانکہ عقلی طور پر یہ موقف بالکل غلط ہے۔ یہاں گوشت کی ایک بوٹی بھی ضائع نہیں ہوتی۔ گوشت ضائع تو وہاں ہوتا ہے۔ وہاں کا معاملہ یہ ہے کہ ایک ہی مقام پر لاکھوں جانور ذبح ہوتے ہیں۔ ضیاع بھی اگر کسی درجہ میں کوئی دلیل ہے تو ضیاع تو وہاں ہے۔ یہاں تو نہیں ہے۔ یہاں تو قربانی کے جانور کی اکثر و بیشتر کوئی چیز بھی ضائع نہیں ہوتی۔ کھالیں ضائع نہیں ہوتیں۔ ان کی قیمت فروخت سے ملک کے بے شمار دارالعلوموں کو ایک معقول آمدنی ہوتی ہے۔ اس آمدنی سے بے شمار رفاہی کام انجام پاتے ہیں۔ بال ضائع نہیں ہوتے، ان سے اون تیار ہوتی ہے۔ اور مختلف نوع کی صنعتوں میں کام آتا ہے۔ یہاں رُدّے ضائع نہیں ہوتے آنتیں اور انتڑیاں تک ضائع نہیں ہوتیں۔ ان کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اب تو خون جمع ہو رہا ہے جو پولٹری فیڈ میں استعمال ہو رہا ہے۔ ہڈیاں جمع ہو کر استعمال ہوتی ہیں۔ گویا قربانی کے گوشت کے علاوہ جو کھانے کے کام آتا ہے اور اس کا کافی حصہ ان لوگوں کو بھی پہنچ جاتا ہے جن بے چاروں کو اس مہنگائی کے دور میں شاید سال بھر کے دوران گوشت خرید نا نصیب نہ ہوتا ہو۔ لہٰذا یہاں تو کسی چیز کے ضائع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں تو قربانی کے جانور کا ریزہ ریزہ آپ استعمال کر لیتے ہیں۔ جبکہ "منیٰ" میں نحر کے مقام پر جو قربانی ہوتی ہے اس کے گوشت کا کچھ حصہ تو استعمال میں آتا ہے باقی رات کو بل ڈوزر آتے ہیں اور تمام ذبح شدہ جانوروں کو کھال سمیت سمیٹ کر ایک عمیق گڑھے میں دبا دیتے ہیں ـــــ پھر مکہ فتح ہوا ہے ۸ھ میں، جس کے بعد مسلمانوں کو حج کا موقع ملا ہے

لیکن احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ مدینہ منورہ میں اس فتح سے قبل ہی سے، عید الاضحیٰ کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین قربانی کیا کرتے تھے۔ میں آپ کو وہ حدیث سنا چکا ہوں کہ آنحضورؐ سے صحابہؓ نے دریافت کیا تھا کہ "یا رسول اللہ! ان قربانیوں کی نوعیت کیا ہے؟" تو جواباً آپؐ نے ارشاد فرمایا تھا۔ "سُنَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ"۔

انسان جب سیدھی راہ سے ہٹتا ہے تو اس کی عقل اوندھی ہو جاتی ہے۔ اور عقلِ عام یعنی Common Sense سے بھی انسان تہی دست ہو جاتا ہے۔ یہ منکرینِ حدیث سب سے بڑی عقلی دلیل یہ دیتے ہیں کہ یہاں قربانی کا گوشت ضائع ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں کی قربانی کے منکر ہیں، البتہ وہاں کی قربانی کے قائل ہیں۔ جہاں فی الواقع گوشت کا کثیر حصہ اور کھالیں، ردّے، آنتیں اور انتڑیاں سب ہی ضائع ہوتی ہیں۔ دوسرے وہاں جو لوگ گئے ہیں وہ حرم شریف میں نمازیں ادا کر رہے ہیں۔ کعبہ شریف کا دیدار اور پھر اس کا طواف کر رہے ہیں۔ منیٰ میں قیام ہو رہا ہے۔ وقوفِ عرفات سے شاد کام ہو رہے ہیں۔ مزدلفہ میں ذکرِ الٰہی ہو رہا ہے: فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْکُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ۔ ان کو طوافِ مقدوم، طوافِ افادہ اور طوافِ وداع کی سعادتیں بھی نصیب ہو رہی ہیں۔ وہ سعی بھی کر رہے ہیں۔ تو ان کے لئے تو بہت سے برکات ہیں جن میں ایک اضافی برکت قربانی کی بھی ہے اور جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ قربانی مفرد پر تو واجب ہی نہیں ہے۔ اسی طرح قرآن کی نیت کرنے والے پر بھی قربانی واجب نہیں ہے۔ قرآن اس حج کو کہتے ہیں کہ اس نیت سے احرام باندھا جائے کہ اسی احرام میں عمرہ بھی کروں گا اور حج بھی ـــــ قربانی تو صرف تمتع کرنے کی نیت والے حاجی پر واجب ہے یعنی وہ پہلے عمرے کی نیت کرے اور پھر عمرے کے بعد احرام کھول دے پھر حج کے موقع پر دوبارہ حج کی نیت سے احرام باندھے۔ یعنی ایک ہی سفر میں آپ نے عمرہ اور حج دونوں کی سعادت حاصل کی۔ لہٰذا اس سہولت یعنی اس تمتع کے شکرانے کے طور پر آپ پر قربانی واجب ہو گئی۔ اب میری بات غور سے سماعت فرمائیے۔ وہ یہ کہ اصل میں شریعتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں قربانی کی

اہمیت اور وجوب زیادہ ان لوگوں کے لئے ہے جو حج پر نہیں گئے ہیں۔ جو حج کے سلسلہ کی بقیہ برکات سے محروم ہیں۔ ان کے لئے عیدالاضحیٰ کے دوگانے کے بعد یہ رکن رکین در حقیقت یہ قربانی ہے۔ جو سنّت ابراہیمی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے متعلق ہے۔

گویا بھیڑوں، بکریوں، گایوں اور اونٹوں کی قربانی اصلاً علامت ہے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اطاعت و فرمانبرداری اور تسلیم و انقیاد اور اس پر مداومت واستقامت کی اس روح کے لئے جو حضرت ابراہیم علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پوری شخصیت میں رچی بسی ہوئی تھی اور ان کی پوری زندگی میں جاری وساری رہی تھی۔

جیسا کہ میں شروع میں ہی آپ کو بتا چکا ہوں کہ صحابہ کرامؓ نے ختم المرسلین و سید الانبیا جناب محمد علیہ الصلوٰہ والسّلام سے دریافت کیا کہ "مَا ھٰذِہِ الاضاحی یا رَسُوْلَ اللہ" تو آپؐ نے جواب میں فرمایا: "سُنَّۃُ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ"۔

البتہ یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ جیسے ہر چیز کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ نماز کا ایک ظاہر ہے۔ یہ قیام ہے، رکوع ہے، سجود ہے، قعدہ ہے یہ ایک خول اور ڈھانچہ ہے۔ اس کا ایک باطن ہے، توجہ اور رجوع الی اللہ، خشوع خضوع بارگاہ رب میں حضوری کا شعور وادراک۔ انابت۔ محبت الٰہی —— نماز کی اصل تو یہ چیزیں ہیں۔ اس کی روح اور جان تو یہی ہیں ؎

شوق اگر نہ ہو تیرا میری نماز کا امام! میرا سجود بھی حجاب میرا قیام بھی حجاب

اسی طرح اس بات کو سمجھ لیجئے کہ جانور کو ذبح کرنا اور قربانی دینا ایک ظاہری عمل ہے۔ یہ ایک خول ہے۔ اس کا ایک باطن بھی ہے اور وہ "تقوای" ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے قربانی کے حکم کے ساتھ متنبہ کر دیا کہ:——

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا	"اللہ تک نہیں پہنچتا ان قربانیوں
وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ	کا گوشت اور ان کا خون ——
(الحج)	ہاں اس تک رسائی ہے تمہارے
	تقوٰی کی۔"

اگر تقویٰ اور روحِ تقویٰ نہیں۔ اگر یہ ارادہ اور عزم نہیں ہے کہ ہم اللہ کے دین کے لئے اپنی مالی و جانی قربانی کے لئے تیار ہیں تو اللہ کے یہاں کچھ بھی نہیں پہنچے گا۔ یعنی ہمارے نامۂ اعمال میں کسی اجر و ثواب کا اندراج نہیں ہوگا۔ گوشت ہم کھالیں گے۔ کچھ دوست احباب کو بھیج دیں گے۔ کچھ غربا کھانے کو لے جائیں گے۔ کھالیں بھی کوئی جماعت یا دارالعلوم والے لے جائیں گے۔ لیکن اللہ تک کچھ نہیں پہنچے گا۔ اگر وہ روح موجود نہیں ہے ـــــ وہ روح کیا ہے۔ وہ تو امتحان، آزمائش اور ابتلاء ہے اور اس میں کامیابی کا وہ تسلسل ہے جس سے سیدنا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پوری زندگی عبارت ہے۔ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط

ہمارے لئے لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ ہم سوچیں، غور کریں اور اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکیں۔ کیا واقعتاً ہم اللہ کی راہ میں اپنے جذبات و احساسات کی قربانی دے سکتے ہیں! کیا واقعتاً ہم اپنی محبوب ترین اشیاء کی اللہ کی راہ میں قربانیاں دے سکتے ہیں! کیا واقعتاً ہم اللہ کے دین کی خاطر اپنے وقت کا ایثار کر سکتے ہیں! چونکہ یہ زمانہ Time is money کا ہے ـــــ کیا ہم اپنے ذاتی مفادات کو اللہ اور اس کے دین کے لئے قربان کر سکتے ہیں! اپنے علائقِ دنیوی، اپنے رشتے اور اپنی محبتیں اللہ کے دین کی خاطر قربان کر سکتے ہیں! اگر ہم یہ سب کر سکتے ہیں تو عید الاضحیٰ کے موقع پر یہ قربانی بھی نورٌ علیٰ نورٌ ـــــ اور اگر ہم اللہ کے دین کے لئے کوئی ایثار کرنے کے لئے تیار نہیں تو جانوروں کی یہ قربانی ایک خول اور ڈھانچہ ہے جس میں کوئی روح نہیں ہے

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی　　فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

جانوروں کا ذبح کرنا رہ گیا ہے۔ اس میں جو روح ابراہیمی تھی وہ موجود نہیں ہے۔ اس نقطہ نظر سے ہم میں سے ہر شخص کو اپنے دل کو ٹٹولنا چاہیئے کہ میں کہاں کھڑا ہوں۔ میری زندگی سنّتِ ابراہیمی کے مطابق ہے یا نہیں!! اگر ہے تو جانوروں کی قربانی کی بھی ہماری زندگی کے ساتھ ایک مطابقت ہے۔ اگر نہیں ہے تو یہ تو ایسا ہی ہے کہ نیم کے درخت پر ثمرِ بہشت کا ایک آم لاکر ہم نے دھاگے سے باندھ دیا ہے۔ اللہ اللہ خیر سلا! ـــــ اس سے وہ درخت آم کا نہیں ہو جائے گا۔ وہ تو نیم ہی کا

درخت ہے اور وہی رہے گا۔ ہماری جو کیفیات بالفعل ہیں وہ تو یہی ہیں کہ ہم نے نیم کے درختوں پر ادھر ادھر سے کچھ آم لاکر ٹانک لئے ہیں اور جس طرح ہم نے دین کے دوسرے بہت سے حقائق کو محض رسموں میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اسی طرح قربانی کی اصل روح بھی ہمارے دلوں سے غائب ہو چکی ہے۔ اور اب اس کی حیثیت بعض کے نزدیک ایک رسم کی ہے اور اکثر کے نزدیک اس سے بھی بڑھ کر ایک قومی تہوار کی ـــــ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ہر سال پندرہ بیس لاکھ سے بھی زائد کلمہ گو حج کرتے ہیں اور بلا مبالغہ پورے کرۂ ارض پر کروڑوں کی تعداد میں ہر سال عید الاضحی کے موقع پر قربانی دی جاتی ہے لیکن وہ روحِ تقویٰ کہیں نظر نہیں آتی جس کی رسائی اللہ تک ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے ۔۔۔ وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج ۔۔۔ یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے

یعنی اللہ کا تقویٰ مسلمانوں میں کم یاب بلکہ عنقا شے بن کر رہ گیا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اس طرف عقل و شعور کے ساتھ ہم میں اس بات کی طلب پیدا ہو کہ ہم متوجہ ہوں کہ معلوم کریں کہ کُل روحِ دین کیا ہے! روحِ قربانی کیا ہے! جس کا ایک نمونہ اور جس کی ایک یادگار ہم ہر سال جانوروں کی قربانیوں کی شکل میں مناتے ہیں ـــــ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی اصل حقیقت کا فہم عطا فرمائے اور ہمیں ہمت دے کہ ہم واقعتاً اپنے مفادات، اپنے جذبات، اپنے احساسات اور اپنی محبتیں ان سب کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر قربان کر سکیں ـــــ اور ہمیں توفیق دے کہ ہم اصل روحِ قربانی کو اپنی شخصیتوں میں جذب کر سکیں اور عید قربان پر جب اللہ کے نام پر جانور کی قربانی کریں اور اسے ذبح کریں تو ساتھ ہی یہ عزم صمیم بھی کر لیں کہ ہم اپنا تن، من، دھن اس کی رضا کے لئے، اس کے دین کی سربلندی کی راہ میں قربان کر دیں گے ـــــ گویا بقول شاعر "میرا سب کچھ میرے خدا کا ہے" اور بفحوائے الفاظ قرآنی:

إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهُ ۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ۝

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

(الحدید : ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا

جس میں بڑی قوت بھی ہے اور لوگوں کے لیے

بڑے فوائد بھی ہیں۔

اتفاق فاؤنڈریز لمیٹڈ

۳۲۔ ایمپریس روڈ۔ لاہور

مولانا مودودی مرحوم اور میں

(از)

ڈاکٹر اسرار احمد

(قسطِ دوم)

مولانا مودودی مرحوم و مغفور سے میرے تعارف کی ابتداء، جیسا کہ میں اس سے قبل بھی بعض مواقع پر عرض کر چکا ہوں، ۱۹۴۵-۴۶ء میں ہوئی تھی جبکہ میں حصار (مشرقی پنجاب، حال ہریانہ، بھارت) میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا۔ اس وقت میرے شعور یا نیم شعور، جو بھی اسے قرار دیا جائے، پر اصل تسلط تو علامہ اقبال مرحوم کی ملی شاعری اور مسلم لیگ کی قومی تحریک کا تھا۔ چنانچہ عملاً میں حصار ڈسٹرکٹ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے ایک فعّال کارکن کی حیثیت سے وابستہ تھا لیکن کچھ ابتدائی کتابچے مولانا مودودی کے بھی میں نے پڑھ لئے تھے اور اُن سے ایک گہرا تاثر بھی میرے ذہن نے قبول کیا تھا۔ میرے بڑے بھائی اظہار احمد جو اُن دنوں میکلیگن انجینیرنگ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھے مولانا مودودی کی تصانیف کا مطالعہ بالاستیعاب کر رہے تھے۔ موسمِ گرما کی تعطیلات کے دوران میں انہیں اکثر مولانا کی تصانیف کا مطالعہ کرتے اور خالص طالبعلمانہ انداز میں نوٹس تیار کرتے دیکھتا تھا۔ چنانچہ یہی کام کچھ ان کے 'دیکھا دیکھی' اور کچھ اپنے ذاتی شوق کے باعث میں بھی کرتا تھا — اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور مسلم لیگ کے حلقوں میں جب مولانا مودودی پر تنقید ہوتی تھی تو میں انکی جانب سے مدافعت کی کوشش کیا کرتا تھا، اگرچہ عملاً میری کامل وابستگی فیڈریشن اور لیگ ہی کے ساتھ رہی۔

حصار میں ان دنوں چوہدری نذیر احمد مرحوم اور مرزا مسرت بیگ مرحوم جماعتِ اسلامی کے فعّال اور سرگرم کارکن تھے - میرا ان دونوں ہی حضرات کے یہاں آنا جانا تھا - چوہدری صاحب کے فرزندِ کلاں ڈاکٹر ظہور احمد سے جو آجکل جہانیاں ضلع ملتان میں مطب کرتے ہیں، میرا کافی گہرا دوستانہ تھا — اُن ہی دنوں حصار میں جماعتِ اسلامی نے ایک درسگاہ قائم کی تھی جس کے سلسلے میں کچھ عرصہ کے لئے مولانا صدرالدین اصلاحی بھی حصار میں مقیم رہے تھے - ان کی بھی اُس زمانے کی ایک ہلکی سی جھلک میرے حافظے کے کسی گوشے میں تا حال محفوظ ہے -

فیڈریشن کی تنظیم کے سلسلے میں میرا ضلع حصار کے دوسرے قصبات خصوصاً سرسہ اور ہانسی بھی جانا آنا رہتا تھا - سرسہ میں میرے قریبی اعزّہ کا ایک خاندان آباد تھا - یعنی میرے والد مرحوم کے حقیقی ماموں جن کے دو صاحبزادگان ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی اور الطاف حسن قریشی جو اُردو ڈائجسٹ، کے حوالے سے مشہور و معروف ہیں - ان کے ایک برادرِ بزرگ حافظ افروغ حسن اُن دنوں جماعتِ اسلامی میں باضابطہ بطور رکن شامل ہو چکے تھے - بنابریں اس گھرانے میں جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کا بہت چرچا تھا - اس ناطے میرا ذہنی تعلّق مولانا مودودی کے ساتھ مزید گہرا اور پختہ ہوا - سرسہ کے قریب ہی جماعتِ اسلامی کے رفقاء نے 'دارالاسلام' پٹھانکوٹ کے طرز پر ایک مثالی بستی گویا 'منی (MINI) دارالاسلام' قائم کی تھی جس کی رُوحِ رواں حکیم عبداللہ روڑوی مرحوم و مغفور تھے - میرا وہاں بھی اکثر آنا جانا رہتا تھا - اور اس کی بعض جھلکیاں بھی میری یادداشت میں تا حال محفوظ ہیں!

۱۹۴۶ء کی تعطیلاتِ موسم گرما کے ایک یادگار سفر کا مختصر ذکر میں اُس روداد میں کر چکا ہوں جو جنوری فروری ۱۹۸۰ء کے 'میثاق' میں شائع ہوئی تھی اور جس کا حوالہ اُس تحریر کے آغاز میں بھی آ چکا ہے - اُس کے دوران، میں نے بھائی اظہار صاحب کی معیّت میں دو یا تین دن 'دارالاسلام' پٹھانکوٹ میں بھی

بسر کرتے تھے ۔ اُس کی بھی جو یادیں اب تک حافظے میں محفوظ ہیں اُن میں سے حسب ذیل قابلِ ذکر ہیں :

مولانا امین احسن اصلاحی کا درس قرآن نمازِ فجر کے بعد ہوتا تھا ۔ اُس میں فضا بالعموم بہت بوجھل ہوتی تھی اور نہ صرف یہ کہ علمی وقار و متانت کا رنگ غالب رہتا تھا بلکہ رُعب اور دبدبے کی کیفیت قائم رہتی تھی ۔ جبکہ مولانا مودودی کا جو درس حدیث نمازِ ظہر کے بعد ہوتا تھا اُس میں ماحول بالعموم شگفتہ رہتا تھا جس میں کبھی کبھی طنز و مزاح کا رنگ بھی شامل ہو جاتا تھا اور بالخصوص جناب عبدالعزیز شرقی اپنے دلچسپ سوالات کے ذریعے اس کے مواقع پیدا کرتے رہتے تھے ۔ جن کے جواب میں اکثر "مولویوں" کی "موشگافیوں" پر طنز کا عنصر شامل ہو جاتا تھا ۔

البتہ بالمشافہ ملاقات میں معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا ۔ چنانچہ مولانا مودودی سے ملاقات آسان نہ تھی جبکہ مولانا اصلاحی سے ہر وقت ملا جا سکتا تھا ۔ پھر گفتگو کے دوران بھی مولانا مودودی سے قدرے بُعد اور فاصلے کا احساس طاری رہتا تھا جبکہ مولانا اصلاحی بالکل 'گھل مل' کر بات کرتے تھے ۔ ایک 'فوری تقابل' (SIMULTANEOUS CONTRAST) کا یہ نقشہ بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے کہ ہم نے ایک بار مولانا مودودی کے کمرے میں جھانکا تو اسے نہایت آراستہ پیراستہ پایا ، فرش پر قالین بھی تھا ، میز کرسی بھی ڈھنگ کی تھی اور ملاقاتیوں کے لئے بھی صوفہ موجود تھا ۔ مولانا مودودی اس وقت اپنی گردن گھومنے والی کرسی کی پشت پر ٹکائے ، آنکھیں بند کئے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے ۔ چنانچہ انہیں ہمارے دروازہ کھولنے اور اندر جھانکنے کی بالکل خبر نہ ہوئی اور ہم نے بھی مزید مخل ہونا مناسب نہ سمجھا ــــــ جبکہ مولانا اصلاحی کے کمرے میں ایک نہایت سادہ سی میز تھی اور اسی قسم کی ایک کرسی جس پر مولانا تشریف فرما تھے ۔ اور سامنے بھی ایک بوسیدہ سا بنچ تھا جس پر ملاقاتی بیٹھتے تھے ۔ چنانچہ وہاں ہم دونوں بھائی کافی دیر تک بیٹھے مولانا سے باتیں کرتے رہے اور ہم نے مولانا سے کسی قسم کا بُعد یا فصل محسوس نہیں کیا ۔

مولانا اصلاحی کے صاحبزادے ابو صالح مرحوم اور مولانا عبدالجبار غازی مرحوم

و مغفور کے صاحبزادے عرفان غازی نے "دارالاسلام" میں روزمرہ کی ضروریات کی ایک چھوٹی سی دکان کھولی ہوئی تھی - مجھے یاد ہے کہ ہم نے بھی ان سے کچھ چیزیں بالکل "بلا ضرورت" خریدی تھیں -

---

۱۹۴۷ء کے ہنگاموں اور فسادات میں ہم جن مراحل سے گذرے اُن کی تفصیل تو ظاہر ہے کہ اس وقت نہ ضروری ہے نہ ممکن - البتہ اُن ایام کا ایک واقعہ میری آئندہ زندگی کے رُخ کی تعیین کے اعتبار سے یقیناً بہت اہم ہے اور وہ یہ کہ جب ہم حصار میں ہندوؤں کے حملوں کے باعث "محصور" ہو گئے تو ان دنوں میں اور بھائی جان ایک مسجد میں "ترجمان القرآن" کے پرچوں میں شائع شدہ "تفہیم القرآن" کی اقساط کا مل جُل کر مطالعہ کرتے تھے جن میں اُن دنوں تفسیرِ سُورۂ یوسف شائع ہو رہی تھی - میں نے ان دنوں تازہ تازہ میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا جس میں سائنس کے ساتھ ساتھ عربی زبان بھی بطورِ مضمون پڑھی تھی اور کچھ اپنے ذاتی شوق اور زیادہ تر استاذِ محترم مولانا محمد حسن مرحوم و مغفور کی مشفقانہ محنت کے نتیجے میں اُس میں خاصی استعداد بہم پہنچالی تھی - اُدھر بھائی جان نے بھی اگرچہ میٹرک تو اسی طرح سائنس اور عربی دونوں کے ساتھ ہی کیا تھا لیکن چھ سال گذر جانے کے باعث اُن کا عربی قواعد کا علم پُرانا ہو چکا تھا۔ چنانچہ "عربی دانی" میں فی الوقت میرا پلڑا اُن سے بھاری تھا - چنانچہ جب کسی معاملے میں بحث کی نوبت آجاتی تھی تو اکثر و بیشتر انہیں میری بات ماننی پڑتی تھی ـــــ بہرحال اصل قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ میرا قرآنِ حکیم کے مطالب و معانی سے پہلا تعارف تھا جو سُورۂ یوسف کی "تفہیم" کے ذریعے ہوا ـــــ اور یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہوگا کہ اصلاً سُورۂ یوسف کی اپنی چاشنی اور مٹھاس اور پھر "ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیان اپنا!" کے مصداق مولانا مودودی کے اندازِ تعبیر و تفہیم کو میرے قرآن حکیم کے ساتھ آئندہ ربط و تعلق کی استواری میں اہم دخل حاصل ہے جس کے لئے مَیں مولانا مودودی کا تازیست ممنونِ احسان رہوں گا۔

حصار کی محصوری کے انڈین آرمی کے ہاتھوں زبردستی خاتمے — اور پھر کچھ عرصہ ایک نو تعمیر شدہ جیل میں قائم 'کیمپ' میں گزار کر جب ہمارا خاندان آگ اور خون کے دریا عبور کرتے ہوئے حصار سے سلیمانکی ہیڈورکس تک ایک سو ستر میل کا فاصلہ بیس دنوں میں ایک پیدل قافلے کے ساتھ طے کر کے اپنے خوابوں کی سرزمین 'پاکستان' پہنچا تو بھائی جان نے تو پہلے کچھ عرصہ مہاجرین کے کیمپوں میں جماعتِ اسلامی کی جانب سے ہونے والے امدادی کام میں صرف کیا اور پھر وہ ایس - ڈی - او محکمۂ انہار کی حیثیت میں اپنی تقرری کا پروانہ لیکر پہلے چیچہ وطنی اور پھر پاکپٹن چلے گئے اور میں کرشن نگر لاہور میں اپنے ایک عزیز کے مکان پر مقیم اور گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف ایس سی (میڈیکل) میں داخل ہو گیا -

ایف ایس سی کے دو سالوں کے دوران میں نے جماعتِ اسلامی کے کرشن نگر لاہور کے حلقہ ہمدردان میں نہایت تندھی اور سرگرمی سے کام کیا - بلکہ یہ کہنا ہرگز مبالغے پر مبنی نہیں ہے کہ اس حلقے کی اصل رُوحِ رواں میں ہی تھا - چنانچہ میں ہی اس کے ہفتہ وار اجتماعات کا اہتمام کرتا تھا اور اُس میں مولانا مودودی کی تحریریں پڑھ کر سُناتا تھا - اور میں نے ہی اُس کا ایک 'دارالمطالعہ' قائم کیا تھا جس کا سائن بورڈ بھی خود اپنے ہاتھ سے تحریر کیا تھا — گوالمنڈی میں واقع دفتر کوثر، میں جو ہفتہ وار اجتماعات جماعتِ اسلامی لاہور کے اُن دنوں ہوتے تھے اُن میں بھی میں پابندی سے شرکت کرتا تھا اور وہاں گاہے بگاہے مولانا مودودی کی زیارت اور ان کے 'وہ تبصرے' سننے کی سعادت بھی نصیب ہو جاتی تھی جو وہ مختلف حلقوں کی رپورٹوں پر کرتے تھے — ریڈیو پاکستان سے 'اسلام کا نظامِ حیات' کے عنوان سے جو پانچ تقریریں مولانا کی اُن دنوں نشر ہوئیں اُن کو ہم کرشن نگر کے چوک میں دریاں بچھا کر ایک جلسے کی صورت میں خود سننے اور دوسروں کو سنانے کا اہتمام کرتے تھے — اغلباً اپریل ۱۹۴۸ء میں جماعتِ اسلامی کے زیر اہتمام پاکستان میں جو پہلا جلسۂ عام موہنی روڈ لاہور پر واقع

خالصہ ہائی اسکول کے میدان میں ہوا تھا اُس میں میں نے پہلی بار مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کی مفصّل تقاریر براہِ راست سُنیں - مولانا مودودی کی تقریر کا عنوان تھا "مطالبۂ نظامِ اسلامی" اور اصلاحی صاحب کی تقریر کا موضوع تھا "آزادی کے اسلامی تقاضے" ــــ اور ان دونوں بزرگوں کی ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو گھنٹوں کی تقریروں کے دوران میری آنکھوں کے کیمرے کے ذریعے ان کی اُس وقت کی شبیہوں کا جو عکس میرے شعور کی سطح پر مرتسم ہوا تھا وہ میرے ذہن کے محافظ خانے، میں تاحال محفوظ ہے ــــ تاہم اُس وقت تک ان دونوں بزرگوں کے ساتھ تعلق کی نوعیت یہ تھی کہ اپنے اور ان کے مابین محبّت و عقیدت کے انتہائی قُرب کے باوصف مقام اور مرتبے کا طویل اور ناقابلِ عبور فاصلہ حائل معلوم ہوتا تھا اور دُور سے ان کی زیارت کرتے ہوئے میں بالکل ایسے محسوس کرتا تھا - جیسے کسی بلند و بالا فصیل کے دامن میں کھڑا سَر اونچا کیے اس کی کسی بلند بُرجی کو دیکھ رہا ہوں -

---

لیکن جلد ہی یہ فاصلے کم ہونے شروع ہو گئے - اس کا ایک سبب تو بالکل فطری اور ریاضیاتی تھا یعنی یہ کہ ۱۹۴۷ء میں میری عمر ۱۵ سال تھی اور مولانا مودودی کی ۴۴ سال - گویا کہ نسبت ایک اور تین کی تھی - لیکن ۱۹۶۰ء میں مولانا کی عمر ۵۷ برس کی تھی اور میری ۲۸ برس گویا نسبت کم ہو کر ایک اور دو کی رہ گئی ــــ لیکن دوسرا اور اہم تر سبب یہ ہوا کہ بعض اسباب سے میں جماعتِ اسلامی اور جمعیتِ طلبہ کے حلقوں میں نمایاں ہو گیا اور اس طرح اِن "اکابرؒ" کی نگاہوں میں بھی آ گیا ــــ اور اس طرح فاصلے کم ہوتے چلے گئے -

ہُوا یوں کہ جیسے ہی مَیں نے ایف ایس سی پاس کر کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں ایم بی بی ایس کلاس میں داخلہ لیا میں نے اپنی رہائش بھی کالج کے ہاسٹل میں منتقل کر لی اور اس طرح اب میرا رابطہ جماعتِ اسلامی کی بجائے اسلامی جمعیتِ طلبہ سے قائم ہو گیا - اور چونکہ مجھے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں کام کا خاصا عملی تجربہ حاصل تھا - لہٰذا میں جمعیت میں ایک [illegible]

ہوگیا اور سالِ اوّل کے دوران ہی مجھے جمعیّتِ لاہور کے حلقۂ میڈیکل کالج کا ناظم بھی مقرّر کر دیا گیا۔ اور اکثر و بیشتر جمعیّت کے اجتماعات میں درسِ قرآن کی ذمہ داری بھی میرے ہی سپرد ہونے لگی۔

اُدھر موسمِ گرما کی تعطیلات میں مَیں والدین کے پاس منٹگمری (حال ساہیوال) جاتا تھا تو وہاں کی مقامی جماعت کے ساتھ سرگرمی سے کام کرتا تھا اور میرے درسِ قرآن کا کچھ ایسا شہرہ جماعت کے قریبی حلقوں میں ہوگیا تھا کہ وہاں بھی تمام تر کم علمی اور نوعمری کے باوجود درسِ قرآن کی ذمہ داری مجھ ہی پر ڈالی جاتی تھی۔

۱۹۵۱ء میں مولانا مودودی نے پنجاب کے صوبائی انتخابات کے ضمن میں پورے صوبے کا تفصیلی اور طوفانی دورہ کیا تو اس کے سلسلے میں منٹگمری میں بھی نے نہایت تندہی سے کام کیا مجھے اب تک یاد ہے کہ روزنامہ 'تسنیم' کا انتخابات نمبر میں نے تانگے پر لاؤڈ اسپیکر لگا کر اُس میں شائع شدہ پنجابی نظمیں ترنّم سے پڑھتے ہوئے پورے شہر کا چکّر لگا کر فروخت کیا تھا ـــــ اور پھر جب مولانا مودودی اس دورے کے سلسلے میں منٹگمری تشریف لانے والے تھے تو میں نے برادرم نبی احمد خاں لودھی (جواب حکومتِ پاکستان کے شعبۂ اطلاعات سے متعلق ہیں) کی معیّت میں ایک کار پر لاؤڈ سپیکر نصب کر کے منٹگمری سے عارف والہ، وہاں سے پاکپتن اور پھر وہاں سے واپس منٹگمری کا تقریباً ایک سو میل کا سفر اس شان سے کیا تھا کہ پورے راستے کے دوران سڑک کے قریب کی تمام آبادیوں اور دیہات میں چھوٹی چھوٹی تقریریں کر کے لوگوں کو مولانا کے جلسے میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ جس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہوا تھا اور دیہات سے کثیر تعداد میں لوگ مولانا کی تقریر سننے کے لئے منٹگمری آئے تھے ـــــ یہ دوسری بات ہے کہ منٹگمری کے اُس پاس کے دیہات کے باشندے بالخصوص وہ جنہیں عرفِ عام میں 'جانگلی' کہا جاتا ہے مولانا کی شستہ اُردو نہ سمجھ سکے اور مایوس ہو کر لوٹ گئے ـــــ اس موقع پر میں نے مولانا مودودی کو برادرم علی احمد کے تعاون سے منٹگمری کے طلبہ کی جانب سے ایک عصرانہ بھی دیا تھا جس میں ایک باضابطہ سپاسنامہ، بھی مولانا کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ جو لکھا بھی میں نے تھا اور پڑھا بھی میں نے

ہی تھا۔ (اور غالباً جماعتِ اسلامی کی تاریخ میں 'سپاسناموں' کی 'بدعت' کا آغاز اسی سے ہوا تھا جس پر بعد میں مجھے ہمیشہ شرمندگی کا احساس ہوتا رہا!)

اس موقع پر اوکاڑہ میں جو اجتماع جماعتِ اسلامی کے زیرِ اہتمام ہوا تھا اُس میں بھی میں نے طلباء کا ایک علیحدہ اجلاس منعقد کرایا تھا جس میں میں نے مولانا کی موجودگی میں اپنی پہلی ارتجالی تقریر کی۔ جس سے مولانا بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اس کی دل کھول کر تحسین فرمائی اور اس طرح میں ذاتی طور پر ان کی نگاہوں میں آتا چلا گیا۔

۱۹۵۱ء میں جب الیکشن بالفعل منعقد ہوئے تو وہ میرے میڈیکل کی تعلیم کے دوران کے مشکل ترین امتحان (یعنی فرسٹ پروفیشنل) کے دن تھے۔ لیکن پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کی جو دُھن اس زمانے میں جماعت اور جمعیت کے ہر رکن اور کارکن پر سوار تھی اس کے زیرِ اثر میں نے بھی رات دن ایک کر کے محنت کی اور اپنی تعلیم اور کیریر کے کسی خیال کو ذہن کے قریب نہ آنے دیا۔ لیکن پھر جب اُس میں جماعت کو شدید ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ تو کچھ اس کے صدمے کے باعث اور کچھ اس لئے کہ اُس کے فوراً بعد رمضان المبارک کا مہینہ آگیا اور اس کے فوراً بعد امتحان ہوا، میری صحت جواب دے گئی۔ اور ابھی امتحان کے تحریری پرچے ہی ہوئے تھے اور پریکٹیکل باقی تھے کہ مجھ پر ٹائیفائڈ کا حملہ ہو گیا۔ نتیجۃً اس کے باوجود کہ تحریری پرچوں میں میں نے پوری کلاس میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی مجھے پورا امتحان (ستمبر ۱۹۵۱ء میں) دوبارہ دینا پڑا۔ (اور الحمدللہ کہ یہ میرے پورے تعلیمی کیریر کا اپنی نوعیت کا واحد واقعہ ہے!)۔

اواخر ۱۹۵۱ء سے اواخر ۱۹۵۳ء تک، دوسال کا عرصہ میرے مولانا مودودی سے انتہائی قرب کا زمانہ ہے۔ جس کے دوران مجھ پر مولانا کی بزرگانہ شفقتیں اور مربیانہ عنایتیں اس حد کو پہنچ گئیں کہ عمر اور مقام و مرتبے کے 'بعد المشرقین' کے علی الرغم بے تکلفی کا عالم یہ ہو گیا کہ 'باہمی' گفت گو میں [illegible]

بھی "دو طرفہ" ہونے لگا۔

نومبر ۱۹۵۱ء میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے سالانہ اجتماع کے موقع پر جو جلسۂ عام وائی ایم سی اے ہال لاہور میں منعقد ہوا، اس میں جو تقریر میں نے مولانا امین احسن اصلاحی کی زیر صدارت کی اُس کا جمعیت اور جماعت کے حلقوں میں بہت شہرہ ہوا۔ خود مولانا اصلاحی نے اُس کی نہایت دِل کھول کر تحسین و تعریف کی۔ چنانچہ جماعت کے مرکز کے حلقے میں بھی اُس کا بہت چرچا ہوا۔ (یہ تقریر طویل عرصے تک "ہماری دعوت اور ہمارا طریق کار" کے عنوان سے جمعیت کے دعوتی لٹریچر کا 'جزو لاینفک' رہی — اور اغلباً اب بھی ہے!)

غالباً یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اواخر دسمبر ۱۹۵۱ء میں جب میں نے لاہور میں جمعیت کے زیر اہتمام ایک 'تربیت گاہ' منعقد کی جس میں درس قرآن مولانا اصلاحی نے دیا اور درسِ حدیث مولانا مودودی نے، تو اس کے بالکل آغاز ہی میں مَیں نے محسوس کر لیا کہ مولانا مودودی کے دِل میں میرے لئے شدید محبت و شفقت موجود ہے — اور مَیں اُن کی خصوصی توجہ اور التفات کا مرکز ہوں۔ میرے لئے اِس احساس میں جو سُرور اور کیف مضمر تھا اس کا اندازہ، ہر شخص بآسانی کر سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میری زندگی کے وہ دَس دِن جو ۲۲ تا ۳۰ دسمبر ۱۹۵۱ء ان بزرگوں کی شفقت و عنایت کے سائے میں بسر ہوئے۔ "حاصلِ زندگی" نہیں تو ایک متاعِ گرانمایہ ضرور ہیں۔ اس لئے کہ ایک تو انہی دِنوں کے دوران میرا 'تدبّر قرآن' کے 'فراہی مکتبِ فکر' سے ابتدائی تعارف ہوا — اور دوسرے ان ہی ایام کے قُربِ پیہم کے نتیجے میں مولانا مودودی سے 'بے تکلفی' کا آغاز ہوا۔ اور بُعد و فصل کے سارے حجابات اُٹھتے چلے گئے۔

مولانا مودودی کی جانب سے بے تکلّفی کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ایک روز میں نے مولانا سے عرض کیا کہ "آج آپ ہمیں اپنے کچھ حالاتِ زندگی سنائیے!" تو مولانا نے بے ساختہ فرمایا "گویا آپ لوگ چاہتے ہیں کہ میں اپنا 'مولود شریف' خود پڑھوں!" جس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔

ادھر اپنی بے تکلفی یا دو گرم ملے تو یارا کہ دگستاخ" کے مصداق گستاخی

کی یہ مثال قابل ذکر ہے کہ تربیت گاہ کے آخری دن ہم نے جملہ اساتذہ اور مربی حضرات کے لئے دعوتِ طعام کا اہتمام کیا — تو جب میں نے مولانا مودودی سے اس کا ذکر کیا اور انہیں شرکت کی دعوت دی تو انہوں نے فرمایا: "اچھا — لیکن پھر میں بھی کوئی چیز لے کر آؤں گا!" — اس پر میں نے بلا جھجک کہا کہ "اگر یہ بات ہے تو پھر ہم لوگ مرغی پکا رہے ہیں، آپ بھی کوئی مقابلے کی چیز لے کر آئیے گا!" اگرچہ مولانا نے 'مجھے اس کا یہ بھرپور' جواب دے کر محفل کو زعفران زار بنا دیا کہ "مرغی کے مقابلے کی چیز تو بلی ہے!" — — — —

نومبر ۱۹۵۱ء کے سالانہ اجتماع میں مجھ پر جمعیت کی دو اہم ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال دیا گیا تھا — ایک جمعیتِ لاہور کی نظامت کا — اور دوسرے جمعیتِ پنجاب کی نظامت کا — اور واقعہ یہ ہے کہ اس سال میں نے جس جوش و خروش اور تندہی سے کام کیا اُس کا تصور اب کرتا ہوں تو خود مجھے حیرت ہوتی ہے جمعیت اگرچہ قائم بھی لاہور ہی میں ہوئی تھی اور وہیں کئی سال تک کا اس کا مرکز قائم رہا تھا لیکن اس وقت تک لاہور میں اُس کی حیثیت طلبہ کے ایک لٹریری سرکل سے زیادہ نہ تھی — اور بقیہ پنجاب میں تو اس کا کہیں نام و نشان تک موجود نہ تھا — لے دے کر صرف راولپنڈی میں ایک جمعیت تھی جو کبھی ماضی میں کسی قدر فعّال رہی تھی لیکن اُس وقت اُس کے صرف کچھ آثار، باقی تھے اور وہ بھی نہایت خستہ اور بوسیدہ حالت میں — یہی وجہ ہے کہ ایک سال قبل جمعیت کا مرکز لاہور سے کراچی منتقل ہو گیا تھا — گویا یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ پنجاب میں جمعیت نیم مردہ حالت میں ہے — لیکن الحمدللہ کہ میں نے جیسے ہی اس کا چارج سنبھالا اس میں زندگی کے آثار ظاہر ہونے شروع ہو گئے — چنانچہ میں نے 'تربیت گاہ' سے فارغ ہوتے ہی جنوری ۱۹۵۲ء میں پورے پنجاب کا ایک طوفانی دورہ کیا۔ جس کے دوران کا ایک واقعہ تو بہت ہی دلچسپ اور قابل ذکر ہے۔

ہوا یوں کہ میں اور برادرم نذیر احمد خالد (جو مجھ سے دو سال جونیئر تھے — اور آج کل ایک غیر ملکی دواساز فرم میں اہم عہدے پر فائز ہیں) سیالکوٹ کے دورے کے لئے صبح چار بجے لاہور سے نکلے — طے یہ تھا کہ سکولوں

میں تقریریں وہ کریں گے اور کالجوں میں مَیں کر دوں گا - انہوں نے اپنی تقریر خوب محنت سے تیار بھی کر لی تھی - لیکن سیالکوٹ میں جب پہلے ہائی اسکول میں جلسہ ہوا اور پانچ سات سو طلبہ اور پچیس تیس اساتذہ کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا "سمندر" اُن کے سامنے آیا تو اُن کی گھگھی بندھ گئی - اور چند جملے کہنے کے بعد وہ یہ کہہ کر بیٹھ گئے کہ بقیہ تقریر اسرار احمد صاحب کریں گے -- میرے لئے ظاہر ہے کہ یہ ایک ناگہانی آفت سے کم نہ تھی لیکن الحمد للہ کہ میں نے صورتحال کو سنبھال لیا - نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن میں میں نے تین ہائی اسکولوں میں تقریریں کیں اور دو کالجوں میں - ایک قدیم مرے کالج (MURRAY COLLEGE) اور دوسرے جناح اسلامیہ کالج (جو اُن ہی دِنوں قائم ہوا تھا اور اس کا غالباً پہلا ہی سال تھا) - اور صورت یہ رہی کہ ایک درسگاہ سے نکلے تو فوراً دوسری میں جا داخل ہوئے - نتیجۃً پورے دن کچھ کھانے پینے کا نہ ہوش آیا نہ موقع ملا - شام کو چار بجے فارغ ہوئے اور خیال ہوا کہ اب کچھ "خورد و نوش" کا معاملہ ہوگا تو جناب آسی ضیائی رامپوری نے اطلاع دی کہ لاہور کے لئے آخری بس کی روانگی کا وقت ہو چکا ہے - چنانچہ اُسی طرح خالی پیٹ لاہور واپسی ہو گئی - جہاں رات گئے پہنچنے کے باعث ہاسٹل کا کچن بند ہو چکا تھا - چنانچہ رات بھی ویسے ہی خالی پیٹ بسر ہوئی ---- بہرحال میری اس بھاگ دوڑ اور محنت و مشقت کا یہ نتیجہ نکلا کہ پنجاب میں جمعیت ایک دم فعّال اور نمایاں ہو گئی - اور اب اس کی حیثیت طلبہ کے ایک مذہبی اور لٹریری سرکل سے بڑھ کر اسلامی تحریک کی ہو گئی - ظاہر ہے کہ اس کی اطلاعات مولانا مودودی کو بھی پنجاب کے طُول و عرض سے مل رہی ہوں گی - اور اُس سے نتیجے میں اُن کے دل میں میرے لئے شفقت و محبت کے جذبات بڑھ رہے ہوں گے - جس کا ایک نمایاں اظہار بھی اُن ہی دنوں ہو گیا -

فروری ۵۲ء میں مَیں نے لاہور میں جمعیت پنجاب کا ایک سہ ماہی اجتماع منعقد کیا - اور اس موقع پر برکت علی اسلامیہ ہال میں مَیں نے خود مولانا ہی کے زیرِ صدارت وہ تقریر کی جو جمعیت کے لٹریچر میں "ہم اور ہمارا کام" کے عنوان سے شامل ہے - تو مولانا نے اسے بہت سراہا - اُن کے دو فقرے میری لوحِ قلب پر

تا حال نقش ہیں ـــــ ایک یہ کہ "پاکستان کے طلبہ کے حالات کا جو نقشہ آپ نے کھینچا ہے وہ آپ ہی کی زبان سے موزوں تھا! یہی باتیں اگر ہم کہتے (واضح رہے کہ اس محفل میں مولانا اصلاحی بھی موجود تھے!) تو طلبہ کو شکایت ہو سکتی تھی" اور دوسرا یہ کہ "آپ نے اپنی اس تقریر میں جو کچھ کہا ہے ہم بھی اُس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے ــ بس تھوڑا سا فرق صرف شخصیت کا باقی رہ جاتا ہے!" مجھے اُس وقت بھی پورا احساس تھا کہ مولانا یہ باتیں میری حوصلہ افزائی کے لئے فرما رہے ہیں لیکن بہر حال اس میں محبت و شفقت اور اپنائیت کے احساس کا جو رس گھلا ہوا تھا میرے لئے اصل اہمیت اُس کی تھی!ـ

۵۲ء کی موسمِ گرما کی تعطیلات میں میں نے ـ "مشرّف گرچہ شُد جامی زلطفش ـ خدایا آں کرم بارے دِگر کُن!" کے مصداق دسمبر ۵۱ء کی تربیت گاہ کے لطف کو مکرر اور دوبالا کرنے کے لئے پھر ایک طویل تر تربیت گاہ منعقد کی ـ اور ایک بار پھر مولانا امین احسن اصلاحی سے درسِ قرآن حاصل کیا اور تدبرِ قرآن کے اُصول و مبادی سیکھے اور "تزکیۂ نفس" پر لیکچر سُنے ـ اور مولانا مودودی سے درسِ حدیث حاصل کیا ـ اور مختلف تحریکی مسائل پر تفصیلی گفتگوئیں سنیں ـ اور آزادانہ تبادلہ خیال ہی نہیں باقاعدہ بحث و تمحیص کے ذریعے دعوتی اور تحریکی معاملات میں بصیرت حاصل کی ـــــ اِس دوسری تربیت گاہ کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ اس کے دوران ہم نمازِ تہجد مولانا مودودی کی امامت میں ادا کرتے رہے ـــــ اور تہجد کے انوار و برکات سے متمتع ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا کی دلآویز ترتیل سے محظوظ ہوتے رہے ـ اور اس کے دوران میرے لئے کسی قدر قابلِ فخر اور دوسرے ساتھیوں کے لئے حد درجہ قابلِ رشک بات یہ رہی کہ اکثر مولانا اپنے کمرے سے ننگے سر ہی آجاتے تھے اور پھر میری قراقلی ٹوپی پہن کر نماز پڑھاتے تھے ـــــ (میری وہ ٹوپی بعد میں جمعیت کے احباب کے حلقوں میں بہت عرصے تک مشہور رہی!)

اب صحیح یاد نہیں کہ یہ واقعہ دسمبر ۵۱ء کی تربیت گاہ میں پیش آیا تھا یا ۵۲ء کی موسم گرما کی تعطیلات کی تربیت گاہ میں ـــ لیکن ہے بہت دلچسپ

اور قابلِ ذکر۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء پر مولانا کی جو تحریر 'تفہیمات' میں شامل ہے مجھے وہ پسند نہ تھی چنانچہ میں نے اس پر تربیت گاہ کے دوران مولانا سے گفتگو کی اور ان کا نقطۂ نظر مزید وضاحت سے معلوم کیا۔ پھر میں نے مولانا اصلاحی صاحب سے بات کی تو انہیں کسی درجے میں نظریۂ ارتقاء کا قائل پایا۔ بس یہاں سے میری 'شرارت' شروع ہو گئی۔ میں روزانہ مولانا اصلاحی سے نظریۂ ارتقاء کے حق میں قرآنی دلائل اور استشہادات حاصل کر لیتا اور پھر مولانا مودودی سے اُن کی بنیاد پر بحث کرتا۔ مولانا میرے اس 'علمِ قرآنی' سے حیران بھی ہوتے اور اُس کی تحسین بھی فرماتے اور پھر اپنے اعتراضات وارد کرتے۔ میں اگلے روز وہ اعتراضات مولانا اصلاحی کے سامنے رکھتا تو وہ بھی حیرت آمیز مسرت کا اظہار فرماتے اور اپنے موقف کے حق میں مزید دلائل دیتے۔ تربیت گاہ کے بقیہ تمام شرکاء ان بحثوں کو سنتے اور محظوظ ہوتے (اور میری 'قرآن دانی' پر زیرِ لب مسکراتے بھی رہتے!)۔ یہ سلسلہ کئی روز جاری رہا اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کا چرچا جماعت کے مرکز میں بھی ہوا اور وہاں یہ راز کھل گیا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ یعنی یہ کہ یہ بحث طلبہ کے ساتھ نہیں بلکہ اصلاً مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے مابین ہو رہی ہے، بواسطۂ اسرار۔ چنانچہ جناب نعیم صدیقی نے ہمیں اس 'شرارت' سے روکا۔ اور اس پر قدرے سرزنش بھی کی۔

بہر حال میری سال بھر کی بھاگ دوڑ اور محنت و مشقت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۵۲ء کے اواخر میں جب اسلامی جمعیت طلبہ کا سالانہ اجتماع منعقد ہوا تو ایک تو اُس موقع پر اجلاسِ عام کسی ہال میں نہیں بلکہ پہلی بار ایک کھلے میدان (یعنی گول باغ لاہور) میں ایک جلسۂ عام کی صورت میں منعقد ہوا —— اور دوسرے مجھے آئندہ سال (۵۳-۵۲ء) کے لئے جمعیت کا آل پاکستان ناظمِ اعلیٰ منتخب کر لیا گیا۔ اور اس طرح ایک تو جمعیت کا مرکز دوبارہ لاہور منتقل ہو گیا۔ اور دوسرے میرے مولانا مودودی سے مزید قریبی روابط کی راہ نکل آئی۔ اس لئے کہ مختلف تنظیمی اور تحریکی مسائل پر مشورہ اور رہنمائی حاصل کرنے کے لئے میں اکثر مولانا کی

خدمت میں حاضر ہوتا رہتا۔ جہاں میرے لئے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ بلکہ جماعت کے مرکز کے اکثر کارکن اس پر حیرت کا اظہار بھی کرتے تھے اور کسی قدر رشک (یا حسد) میں بھی مبتلا تھے کہ اس کے باوجود کہ مولانا کی زندگی بہت منضبط تھی اور وہ اپنے اوقاتِ کار کی سختی سے پابندی نہ صرف خود کرتے تھے بلکہ دوسروں سے بھی کرواتے تھے، میرے لئے اُن کا دروازہ ہر وقت کھُلا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار میں اپنے چند ساتھیوں سمیت مولانا کی خدمت میں رات کے گیارہ بجے حاضر ہوا اور مولانا نے ہمیں اپنی خوابگاہ ہی میں شرفِ باریابی عطا فرمایا۔

فروری ۵۲ء میں منعقدہ اجتماعِ جمعیتِ پنجاب کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اُس کا ایک اور واقعہ بھی بہت اہم اور قابلِ ذکر ہے اور آگے بڑھنے سے قبل اُس کا تذکرہ مناسب رہے گا ــــ ہوا یہ کہ مولانا نے جو تقریر اُس روز میری تقریر کے بعد فرمائی اُس میں یہ الفاظ بھی تھے کہ "میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ ایک جانب دعوتی اور تحریکی مشاغل میں بھرپور حصّہ لیں ــــ لیکن دوسری جانب اپنی تعلیم میں بھی دوسروں سے ہرگز پیچھے نہ رہیں بلکہ اُس میدان میں بھی اپنے ساتھی طلبہ سے آگے رہیں ــــ!" میں نے جب مولانا کی اس نصیحت کی روشنی میں اپنا جائزہ لیا تو محسوس کیا کہ یہ ایک ناقابلِ عمل بات ہے۔ چنانچہ میں اُسی رات مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور بڑے تفصیل کے ساتھ عرض کیا کہ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ سر آنکھوں پر لیکن یہ ہے ناممکن العمل! ــــ میں نے پرائمری سے اُس وقت تک کا پورا ریکارڈ مولانا کے سامنے رکھ دیا کہ میں نے پرائمری میں بھی وظیفہ حاصل کیا تھا ــ پھر مڈل کے ورنیکلر فائنل کے امتحان میں بھی وظیفہ حاصل کیا ــ پھر میٹرک میں میں متحدہ پنجاب کے تمام مسلمان طلبہ میں چوتھے نمبر پر تھا اور میرے اپنے اسکول میں جو طالب علم میرے بعد دوسرے نمبر پر تھا اُس کے اور میرے نمبروں میں ۹۰ کا فرق تھا (میں نے کل ۸۵۰ میں سے ۷۱۸ نمبر حاصل کئے تھے اور اُس نے ۶۲۸ء) بعد ازاں میں نے ایف ایس سی میڈیکل میں نمایاں پوزیشن حاصل کی اور میرٹ (MERIT) سکالرشپ حاصل کیا۔ پھر میڈیکل

کالج میں فرسٹ ائیر میں مَیں کلاس میں اوّل رہا اور ایک مزید وظیفہ مجھے مِلا (چنانچہ میڈیکل کالج کے سالِ دوم کے دوران میرے پاس دو وظائف تھے!) ـــ لیکن اب جمعیت کی جو گوناگوں ذمّہ داریاں میرے کاندھوں پر آگئی ہیں اُنکے پیشِ نظر میرے لئے ناممکن ہے کہ میں اپنی اُس پوزیشن کو قرار رکھ سکوں ـــ تو فرمائیے کہ میں کیا کروں؟ ـــ اِس پر مولانا نے نہ صرف یہ کہ کھلے دل کے ساتھ اپنی غلطی کو تسلیم کیا بلکہ پوری صفائی کے ساتھ اعتراف فرمایا کہ ـــ "میرا اپنا حال یہ ہے کہ جب سے جماعتِ اسلامی کی تحریک عوامی دَور میں داخل ہوئی ہے میرا مطالعہ بالکل منقطع ہوچکا ہے اور اب میں صرف اپنے سابقہ مطالعے سے کام چلا رہا ہوں!!" ـــ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ مولانا الفاظ مجھے تاحال جوں کے توں کیسے یاد رہ گئے کہ میں انہیں واوین (یعنی INVERTED COMAS) کے ساتھ نقل کر رہا ہوں - واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے یہ الفاظ میرے لوحِ قلب پر کندہ ہیں اس لئے کہ میری اپنی زندگی کے آئندہ رُخ کی تعیین میں ان کو فیصلہ کن دخل حاصل ہے - اور میں نے اپنی زندگی میں دنیوی مستقبل (CAREER) اور پیشہ وفن (PROFESSION) کو ثانوی درجہ دینے اور دعوت و اقامت دین کی جدّوجہد کو اوّلیت دینے کا فیصلہ غیر شعوری طور پر نیم دِلی کے ساتھ نہیں بلکہ پوری طرح جانتے بوجھتے اور خالص شعوری طور پر کیا تھا اور اس میں مولانا کے ان الفاظ کو بھی اہم دخل حاصل ہے ـــ!

۱۹۵۳ء کو پاکستان کی تاریخ میں انتہائی اہمیت حاصل ہے - اس لئے کہ اس کے دوران ایک جانب تو پاکستان کی عوامی سیاست کے میدان میں وہ عظیم ہنگامہ خیز تحریک برپا ہوئی جس نے ہمیشہ کے لئے پاکستانی سیاست کی گاڑی کو پٹڑی سے اتار کر رکھ دیا - چنانچہ پاکستان میں پہلی بار ایک محدود پیمانے پر مارشل لاء نافذ ہوا - اور دوسری طرف پاکستانی طلبہ میں بھی بائیں بازو کے عناصر نے عظیم ترین ہل چل پیدا کی جس کے نہایت دُوررس اثرات مترتب ہوئے۔ ۵۳ء کی اَنٹی قادیانی تحریک کا آغاز تو مجلس احرار کے اُن زعماء نے کیا تھا جو

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کی صورت میں جو شکستِ فاش انہیں ہوئی تھی اُس کے زیرِ اثر پورے چھ سال منفاد زیرِ پردہ رہے تھے اور اب اچانک اَنٹی قادیانی تحریک کا علم اٹھائے منظرِ عام پر ظاہر ہوتے تھے — لیکن بعد میں اس میں دوسرے مذہبی عناصر بھی کچھ دلی آمادگی کے ساتھ اور کچھ مجبوراً شامل ہوتے چلے گئے - دلی آمادگی کے ساتھ شامل ہونے والوں میں سرِفہرست حلقہ دیوبند کے وہ علماءِ کرام تھے جو مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زیرِ قیادت کانگرس کے ہمنوا رہے تھے — اور حالات کے دباؤ کے تحت شامل ہونے والوں میں نمایاں اوّلاً حلقہ دیوبند کے مسلم لیگی علماء اور ثانیاً بریلوی مکتبِ فکر کے علماء و زعماء تھے — جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی اس معاملے میں بالکل "نہ تابِ وصل دارم نے طاقتِ جدائی!" والے مخمصے میں مبتلا ہو گئے تھے اس لئے کہ جماعت کی تاسیس جن اُصولی نظریات کی بنیاد پر ہوئی تھی اُن کی رُو سے اُس کا اس تحریک میں حصّہ لینا کسی طور سے صحیح نہ بنتا تھا — لیکن سیاسی اکھاڑے میں اتر جانے کے باعث عوامی دباؤ کو بالکل نظر انداز کر دینا بھی اُس کے لئے ممکن نہ تھا - چنانچہ اُس کا معاملہ مسلسل "نیمے دروں نیمے بروں" کا رہا یعنی یہ کہ "بظاہر" تحریک میں شامل بھی ہیں لیکن "بباطن" اُس سے علیحدہ اور بری بھی —!! — بہرحال اس وقت پیشِ نظر اس طویل اور تلخ داستان کی تفصیل بیان کرنا نہیں بلکہ اس واقعے کا اظہار ہے کہ اُس زمانے میں میرا نہایت قریبی رابطہ مولانا سے قائم رہا - اور اس پورے معاملے کے دوران کی نشیب و فراز کا علم مجھے بہت قریب سے ہوتا رہا - مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ جس روز "متحدہ مجلسِ عمل" نے "راست اقدام" یعنی Direct Action کے آغاز کا اعلان کیا — اور جماعتِ اسلامی کی جانب سے یہ بیان اخبارات میں شائع ہوا کہ ہم اس راست اقدام میں تو شریک نہیں ہیں "البتہ ہم نے اپنے حصّے کا کام اپنے ذمّے لے لیا ہے" اُس روز میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ بہت خوش اور ہشاش بشاش تھے اور میں نے پہلی بار اُن کی زبان سے انگریزی کا ایک محاورہ سنا — مولانا نے فرمایا: "ہم اس پوری صورتِ حال سے WITH FLYING

COLOURS ، نکلے ہیں" ـــــ لیکن افسوس کہ مولانا کی یہ خوشی فہمی بہت عارضی ثابت ہوئی اور نہ صرف یہ کہ حکومت کے 'جوابی اقدام' کی لپیٹ میں دوسرے علماء و زعماء کے ساتھ ساتھ مولانا بھی آ گئے بلکہ وقت کے بعض 'فراعنہ' نے جو موقع کی تاک ہی میں تھے بھرپور وار کیا اور مولانا پر مارشل لاء کے تحت فوجی عدالت میں مقدمہ قائم کر دیا۔

یہ زمانہ، جمعیت اور جماعت کے ہزاروں کارکنوں کی طرح مجھ پر بھی رنج و غم کی شدت اور حزن و ملال کے غلبے کا تھا۔ (۱۹۵۳ء کو عہد حاضر کی اس اسلامی تحریک کا جو جماعت اسلامی کے تحت جاری تھی 'عام الحزن' قرار دیا جائے تو یہ بات غلط نہ ہوگی!) جب تک لاہور سنٹرل جیل میں مقدمے کی سماعت جاری رہی میں روزانہ وہاں جاتا رہا ـــ اور مقدمے کی کارروائی سننے کے ساتھ مولانا کی زیارت سے مشرف ہوتا رہا اور اُن کے صبر و سکون سے خود اپنے جذبے اور ولولے کے لئے حرارت حاصل کرتا رہا۔ چوہدری نذیر احمد مرحوم کا 'دفاع' میرے اندازے میں اتنا جاندار نہ تھا جتنی توقع تھی ـــ جبکہ سرکاری وکیل (غالباً اعوان صاحب) کا آخری جوابی حملہ بہت زوردار تھا ـــ اور میرا دل اُسی وقت ڈوب سا گیا تھا۔ تاہم جب تک فیصلے کا اعلان نہ ہوا ایک اُمید سی قائم رہی ـــ لیکن جب پھانسی کی سزا کا اعلان ہوا تو اعصاب پر بجلی سی گری اور ایک بار تو دُنیا اندھیر ہوگئی! اس وقت جو کیفیت ہم سب کی تھی وہ ناقابل بیان ہے۔ تاہم مایوسی کے اس غلبے اور رنج و غم کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہم سب کیلئے جو چیز نہایت ہمت افزا اور حد درجہ حوصلہ بخش تھی وہ یہ کہ مولانا نے پھانسی کی سزا کا حکم بھی نہایت صبر و سکون کے ساتھ سنا اور بعد میں بھی پھانسی کی سزا یافتہ قیدیوں کے مخصوص کپڑے پہننے سے لیکر کال کوٹھری میں داخل کئے جانے اور وہاں موت کے انتظار کے صبر آزما لمحات میں کسی بھی مرحلے پر اُن کے پائے ثبات میں کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوا۔

میں ان دنوں لاہور سے جمعیت کے زیر اہتمام پندرہ روزہ 'عزم' شائع کیا کرتا تھا جس کی ادارت کے فرائض میں اور ڈاکٹر سید اسلم (حال اسسٹنٹ

پروفیسر، انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیو ویسکلر ڈیزیز نہ، کراچی) مشترکہ طور پر سرانجام دیتے تھے۔ میں نے اس موقع پر اس میں ایک تو حضرتِ جگر مراد آبادی کی وہ غزل شائع کی جو ایسے محسوس ہوتا تھا کہ خاص اسی موقع کے لئے کہی گئی تھی ؎

یہ صحن و روش یہ لالہ و گل ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریبِ جنوں کے پردے میں تعمیرِ گلستاں ہوتے ہیں
بیدار عزائم ہوتے ہیں، اسرار نمایاں ہوتے ہیں
جتنے وہ ستم فرماتے ہیں سب عشق پہ احساں ہوتے ہیں
یہ خون جو ہے مظلوموں کا ضائع تو نہ جائے گا۔ لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرفِ بہاراں ہوتے ہیں
اور ؎ جو حق کی خاطر جیتے ہیں مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر
جب وقتِ شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں!

اور دوسرے جناب رئیس امروہوی کا ایک قطعہ بھی جو روزنامہ جنگ میں شائع ہوا تھا تھوڑے سے تصرف کے ساتھ شائع کیا: ؎

وہ وقت آیا کہ ہم کو قدرت ہماری سعی و عمل کا پھل دے
بتا رہی ہے یہ ظلمتِ شب کہ صبح نزدیک آ رہی ہے،
ابھی ہیں کچھ امتحان باقی، خلاکتوں کے نشان باقی
قدم نہ پیچھے ہٹیں کہ قسمت ابھی ہمیں آزما رہی ہے!
رئیسِ اہلِ نظر سے کہہ دو کہ آزمائش سے جی نہ ہاریں
جسے سمجھتے ہو آزمائش وہی تو بگڑی بنا رہی ہے!

اس کے آخری شعر کو میں نے 'رئیس' کی زیر کے ساتھ شائع کیا۔ گویا مصرعہ یوں بن گیا کہ ع "رئیسِ اہلِ نظر سے کہہ دو کہ آزمائش سے جی نہ ہاریں!" اور اس طرح یہ تحریک کے ایک ادنیٰ کارکن کی جانب سے پیغام بن گیا تحریکِ اسلامی کے قائد و رئیس کے نام!!

بہرحال خدا خدا کر کے رنج و غم کے یہ بادل چھٹے، مولانا کی سزا میں تخفیف ہوئی اور اگرچہ طویل اسیری کی جدائی کا خیال [illegible]

گیا کہ — یار زندہ صحبت باقی!

دوسری جانب ۵۳ء ہی میں پاکستان کے طول و عرض میں سوشلسٹ نظریات اور بائیں بازو کے رجحانات کے حامل طلباء نے سر اٹھایا اور ایک ملک گیر تحریک شروع کر دی جس کا عنوان تھا: 'طلباء کے مسائل اور مشکلات' اس تحریک کا اصل مرکز کراچی تھا اور وہاں اِن عناصر نے تقریباً تمام کالجوں کی یونینوں پر قبضہ کر کے ایک 'بین الکلیاتی ادارہ' INTERCOLLEGIATE BODY کے نام سے قائم کیا جس کا مخفف I.C.B. تھا اور طلباء کے مسائل اور مشکلات کے حوالے سے بھرپور ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔ اُس وقت کی کراچی جمعیت کی قیادت نے اس صورتِ حال سے بایں طور عہدہ برآ ہونے کی سعی کی کہ اپنے پرچے 'اسٹوڈنٹس وائس' (STUDENTS VOICE) کو طلباء کے کاسب سے بڑا علمبردار (CHAMPION) بنا دیا جس نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا۔ لیکن جب ایجی ٹیشن کی آگ پوری طرح بھڑکی تو معلوم ہوا کہ اس کی قیادت میں جمعیت کا کوئی حصّہ نہیں ہے — بلکہ قیادت کُل کی کُل کے ہاتھ میں ہے — میں لاہور میں بیٹھا اس صورتِ حال کو سخت پریشانی اور اضطراب کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ لیکن چونکہ جمعیت کے وسائل ان دنوں بہت محدود تھے اور ہوائی سفر تو بالکل ہی خارج از بحث تھا۔ لہٰذا اس کے باوجود کہ ناظم اعلیٰ میں تھا اور میرے نزدیک جمعیت کراچی کی یہ روش سخت غلط تھی' تاہم میں بالکل اثر انداز ہونے کی پوزیشن میں نہ تھا — اُن دنوں میں بارہا مولانا کی خدمت میں خاص اس مسئلے میں رہنمائی حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا۔ تو اگرچہ وہ خود اپنے معاملات اور اینٹی قادیانی تحریک سے پیدا شدہ مسائل میں بہت الجھے ہوئے تھے تاہم میری باتیں پوری توجہ اور غور سے سنتے اور میرے ساتھ اتفاقِ رائے کا اظہار فرماتے' لیکن ایک تو خود اپنی مصروفیات اور پریشانیوں کے باعث اور دوسرے اس بنا پر کہ جمعیت قانوناً جماعت کے تابع نہ تھی اس ضمن میں اثر انداز ہونے

سے معذوری کا اظہار فرماتے ۔

تاہم جب کراچی کے قائدین کراچی میں اپنی فتح کے جھنڈے لہراتے عازمِ پنجاب ہوئے تو میں نے آگے بڑھ کر ملتان ہی میں اُن کا بھرپور 'خیر مقدم' کیا ۔ اور پھر لاہور، لائلپور (حال فیصل آباد) اور راولپنڈی ہر جگہ ان کا پیچھا کر کے اُن کی مہم کو بالکل ناکام بنا دیا ۔ اگرچہ لاہور کے بعض طلباء کی جانب سے مجھے قتل کی دھمکیاں بھی موصول ہوئیں ۔ اور خود جمعیتِ لاہور کے بعض عناصر بھی میرے اس طرزِ عمل کے مخالف رہے ۔ لیکن الحمد للہ کہ مولانا مودودی نے میرے اس طرزِ عمل سے پورا اتفاق فرمایا اس پر ہر طرح صاد کیا ۔ اور وہ میری ہر طرح سے ہمت افزائی فرماتے رہے تا آنکہ وہ خود اُس مخمصے میں گرفتار ہو گئے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے ۔

تاہم اس مسئلے پر میرے اور کراچی جمعیت کی اُس وقت کی قیادت کے درمیان شدید اختلافِ رائے پیدا ہو گیا جس میں بعد میں بعض دوسری چیزیں بھی شامل ہو گئیں اور یہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی ۔ نتیجۃً میں نے دورانِ سال ہی جمعیت کی نظامتِ علیا کی ذمہ داری سے علیحدگی اختیار کر لی اور آئندہ سالانہ اجتماع تک کے لئے ایک 'قائم مقام ناظمِ اعلیٰ' کا تقرر کر دیا ۔ اور آئندہ سالانہ اجتماع کے موقع پر جو نومبر ۵۳ء میں کراچی میں منعقد ہوا، جہانگیر پارک میں منعقدہ ایک جلسۂ عام میں زیرِ صدارت ڈاکٹر عمر حیات ملک مرحوم ایک مفصل تقریر (جو ایک گھنٹہ چالیس منٹ پر پھیلی ہوئی تھی) "طلباء کے مسائل اور اُن کا حل" ہی کے موضوع پر کی جس میں اپنے نقطۂ نظر کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا ۔

اس تقریر کے بارے میں جو انتہائی تحسین آمیز جملے ڈاکٹر عمر حیات ملک نے کہے وہ برادرم ظفر اسحٰق انصاری نے 'اسٹوڈنٹس وائس' میں شائع شدہ رپورٹ میں درج کر دیئے تھے ــــ لیکن میرے لئے سب سے بڑھ کر مسرت بخش اور حوصلہ افزا واقعہ یہ تھا کہ جیسے ہی میں تقریر ختم کر کے ڈائس سے نیچے اُترا ایک عمر رسیدہ سفید ریش بزرگ نے دوڑ کر مجھے گلے لگا لیا اور فرمایا : وہ جتنی دیر تم

وہاں کھڑے تقریر کرتے رہے میں وہاں تمہاری بجائے مولانا مودودی کو دیکھتا رہا!" کافی دیر تک اپنے سینے سے چمٹائے رکھنے کے بعد جب انہوں نے مجھے علیحدہ ہونے کی اجازت دی تو میں نے دیکھا کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے جن سے اُن کی داڑھی بھیگ گئی تھی — اُن آنسوؤں میں غالباً مولانا مودودی کی اسیری کا غم بھی شامل تھا — اور اس بات کی خوشی بھی کہ جو شمع انہوں نے روشن کی ہے اُس کی روشنی میں قدم آگے بڑھانے والے بہت سے نوجوان پیدا ہو گئے ہیں - یعنی ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں — یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں!

(جاری ہے!)

بقیہ 'عرضِ احوال'

اشاعت کے مراحل سے گزر رہی ہے - اور ان شاء اللہ اس ماہ کے آخر تک مکتبہ سے دستیاب ہو سکے گی -

امیر محترم کا ایک اور خطاب "تنظیم اسلامی کی دعوت اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں" ٹیپ سے منتقل کرنے کا کام جاری ہے - یہ خطاب سُورۂ احزاب کی مشہور آیت لقد کان لکم فی رسول اللہِ اُسوۃٌ حسنۃٌ کی روشنی میں آج سے تقریباً دو ڈھائی سال قبل کیا گیا تھا - ان شاء اللہ یہ خطاب 'میثاق' کے نومبر کے شمارے کی زینت بنے گا - تربیت گاہ میں شریک ہونے والے حضرات اگر اس کا شرکت سے قبل مطالعہ کر لیں گے تو اللہ نے چاہا تو یہ ان کے لئے مفید ثابت ہوگا -

اپنی قیمتی کتابوں کو محفوظ رکھئے

اپنی قیمتی کتابوں کو محفوظ رکھنے کیلئے پلاسٹک کور چڑھوائیے -

خوب صورت پلاسٹک فائلوں اور نوٹ بکس کا مرکز

ایس - ٹی - اسٹیشنرز

اظہار لمیٹڈ کی

تیار چھتیں

پری کاسٹ پری اسٹریسڈ کنکریٹ کے گارڈر سلیب وغیرہ

معلومات اور خریداری کے لیے رجوع فرمائیں

صدر دفتر ۶ کوثر روڈ اسلام پورہ لاہور
فون :- ۶۹۵۲۲ - ۶۱۵۱۴

فیکٹریوں کے دفاتر

- ۲۵ کلومیٹر شیخوپورہ روڈ۔ لاہور
- جی ٹی روڈ کھڑالہ ، نزد گجرات
- جی ٹی روڈ سواں کیمپ راولپنڈی فون :- ۶۸۱۲۷

سیلز ڈپو

- فیروز پور روڈ نزد جامع اشرفیہ لاہور فون :- ۴۱۳۵۶۹
- شیخوپورہ روڈ نزد نیشنل ہوزری فیصل آباد فون ۵۰۶۲۶

بااختیار تیار کنندگان

مختار سنز لمیٹڈ ۔ پنجاب پری کاسٹنگ لمیٹڈ

کنکریٹ پری کاسٹنگ لمیٹڈ

مختصر سوانح

مولانا سید وصی مظہر ندوی

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ

اسلامی علوم کے ماہروں میں ایک طبقہ محدثین کہلاتا ہے - یہ وہ محقق ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو محفوظ کرنے کی خدمت انجام دی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام اسلام کا پیغام لے کر تیزی کے ساتھ عرب سے نکل کر آس پاس کے بہت سے ملکوں میں پھیل گئے - ان بزرگوں کی کوششوں سے بہت کثرت سے لوگ مسلمان ہو گئے -

ان مسلمان ہونے والوں کو فطری طور پر شوق تھا کہ اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنیں، حالات معلوم کریں، اور احکام و ہدایات سے واقف ہو کر ان پر عمل پیرا ہوں - چنانچہ ہر صحابی کے گرد حضور اکرمؐ سے محبت کرنے والوں کا حلقہ قائم ہو گیا - یہ لوگ یہ باتیں سنتے، سُن کر یاد کر لیتے، لکھ لیتے اور پھر دوسرے لوگوں کو سناتے - اس طرح حضورؐ کی تعلیمات اور باتیں لاکھوں آدمیوں تک پھیل گئیں

محدثین نے پہلے ان سب باتوں کو جمع کرنے کا اہتمام کیا - شہر شہر اور قریہ قریہ کی خاک چھانی، جہاں سے کوئی بات ملی اس کو محفوظ کر لیا -

پھر ان باتوں کے بیان کرنے والوں کے حالات جمع کئے تاکہ ہر بات کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جا سکے -

روایتوں کو جانچنے کے لئے اصول بنائے اور تمام روایتوں کو چھان پھٹک کر صحیح روایات کو الگ کر کے ان کو اُمت کی ہدایت اور عمل کے واسطے محفوظ کر دیا۔

ان محدثین میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا نہایت بلند مقام ہے محدثین کی اکثریت عجمی اقوام سے تعلق رکھتی ہے لیکن امام احمد خالص عرب تھے -

آپ کی ولادت بغداد کے اندر ربیع الاوّل ۱۶۴ھ میں ہوئی۔

اس دَور کے تعلیمی نظام کے مطابق سب سے پہلے آپنے قرآن مجید حفظ کیا — اور عربی زبان کی تعلیم مکمل کی۔ بغداد اس زمانے میں علوم و آداب کا مرکز تھا امام احمدؒ نے علم حدیث کے حصول کی طرف توجہ کی چنانچہ سب سے پہلے امام ابوحنیفہؒ کے ممتاز شاگرد امام ابو یوسفؒ اور محدث ابو حازمؒ واسطیؒ سے استفادہ کیا۔ پھر کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ، یمن، شام وغیرہ کا سفر کیا اور وہاں کے ممتاز محدثین سے استفادہ کیا۔

۴۰ سال کی عمر میں حدیث کا درس دینا شروع کیا۔ اور اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ حلقۂ درس میں پانچ پانچ ہزار افراد شرکت کرتے تھے جن میں لکھنے والے کی تعداد پانچسو تک جا پہنچتی تھی۔

امام احمد ابن حنبل انتہائی زاہد اور خدا تعالےٰ سے ڈرنے والے تھے۔ انہوں نے زندگی میں کبھی کسی بادشاہ یا امیر کا عطیہ قبول نہیں کیا۔ عباسی خلیفہ متوکل نے جو انکا بیحد معتقد تھا ایک بار ان کو شاہی مہمان کی حیثیت سے اپنے ہاں بلا کر چند روز ٹھہرنے پر مجبور کیا تو آٹھ دن تک مسلسل روزے رکھتے رہے اور شاہی کھانے کو چکھنا بھی گوارا نہ کیا۔

ان کی تصانیف کی تعداد دس سے زیادہ ہے لیکن سب سے زیادہ شہرت اور عظمت انکی مسندؒ کو حاصل ہوئی۔ مسند حدیثوں کے اس مجموعے کو کہا جاتا ہے جس میں ہر صحابی کی روایت کردہ تمام حدیثیں ایک ساتھ جمع کر دی جائیں۔

امام احمد کے زمانے تک محدثین کی زیادہ تر توجہ احادیث کو جمع کرنے اور محفوظ کرنے کی طرف تھی ان کے زمانے میں احادیث کی چھان پھٹک کا کام ابھی شروع نہ ہوا تھا۔ چنانچہ امام صاحب نے بھی اپنی مسند میں زیادہ تر احادیث جمع کرنے کے کام کو مقدم رکھا۔ انہوں نے اپنی اس مایۂ ناز کتاب کی تالیف کا آغاز ۱۶ سال کی عمر میں کر دیا تھا اور زندگی کی آخری گھڑیوں تک اس کام میں مشغول رہے۔ مسند امام احمد میں تقریباً ۷۰۰ سو صحابہ کی روایات جمع کی گئیں ہیں جبکہ احادیث کی تعداد تیس ہزار تک پہنچتی ہے۔

امام احمد ابن حنبل فقہ کے بھی امام ہیں - چنانچہ دُنیائے اسلام جن چار فقہی مسلکوں کی پیروی کرتی ہے ان میں سے ایک طریقہ امام احمد ابن حنبل کا طریقہ ہے - امام صاحب نے اپنی فقہ میں حتی الوسع احادیث کو اولیّت دی ہے - وہ ضعیف حدیث کو بھی قیاس کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں -

امام صاحب کو اپنی زندگی میں دو شدید آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا ایک آزمائش عباسی خلیفہ معتصم کے دور میں پیش آئی جب ان کو حکومت کی طرف سے مجبور کیا گیا کہ وہ معتزلی مسلک کو مان کر فتویٰ دیں کہ جو شخص قرآن مجید کو مخلوق نہیں مانتا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے - امام صاحب کہتے تھے میں کسی عقیدے کو اسلام کے مطابق صرف اس صورت میں مان سکتا ہوں جب اسکی سند اللہ کی کتاب یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت میں موجود ہو - حکومت کا مطالبہ نہ ماننے کی وجہ سے امام صاحب کو تقریباً ۲۸ ہفتے قید رکھا گیا اور ۳۴ کوڑے مارے گئے ایک جلّاد صرف دو کوڑے لگاتا پھر تازہ دم جلاد کو بلایا جاتا - مارنے والے کا خود بیان یہ ہے کہ کوڑے اس غضب کے تھے کہ اگر ہاتھی کو مارے جاتے تو وہ چیخ پڑتا - لیکن امام صاحب اس ساری آزمائش میں ثابت قدم رہے -
دوسری آزمائش معتصم کے بعد متوکل کی طرف سے انعام و اکرام کی صورت میں ظاہر ہوئی معتصم جتنا دشمن تھا متوکل اس سے زیادہ معتقد تھا - لیکن امام صاحب اس آزمائش میں بھی ثابت قدم رہے انہوں نے بادشاہوں کے عطیے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور زہد و قناعت کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آنے دی -

آپ نے ۷۷ سال کی عمر میں ۹ دن بستر علالت پر رہ کر ۱۲ ربیع الاوّل ۲۴۱ھ کو وفات پائی - اِنّا للہ و انا الیہ راجعُونَ ؕ نماز جنازہ میں اتنی کثیر مخلوق نے شرکت کی جس کی مثال ملنی ناممکن ہے مؤرخین کا اندازہ یہ ہے کہ نمازِ جنازہ میں ۸ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار خواتین نے شرکت کی - ان کو یہ مقبولیت ان کے علمی مرتبے کے علاوہ انکی سیرت و کردار کی پختگی کی وجہ سے ملی - رحمہ اللہ و ادخلہ فی عبادہ الصالحین -

THE ORIGINAL
Coca-Cola
Have a Coke and a smile.
"COCA-COLA" AND "COKE ARE THE REGISTERED TRADE-MARKS WHICH IDENTIFY THE SAME PRODUCT OF THE COCA-COLA COMPANY.
paragon

افکار و آراء

ایک خاتون کا فکر انگیز خط

مکرمی و محترمی ڈاکٹر صاحب السلام علیکم و رحمۃ اللہ

گذشتہ کئی ماہ سے اخبارات میں، اس کے بعد مئی ۸۲ء کے 'میثاق' میں پردے کے متعلق بہت کچھ پڑھنے اور سیکھنے کو ملا۔ بر ہم مغرب زدہ خواتین کا مخالفانہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ حال ہی میں حکومتِ خداداد پاکستان کے شعبۂ خواتین کی محترمہ سلیمہ احمد کا بیان بھی دیکھنے میں آیا۔ جس میں انہوں نے خواتین یونیورسٹی اور برقعہ و چادر کو مضر قرار دیا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ یہ خواتین خود کو کہلواتی تو مسلمان ہیں لیکن اسلام کے قائم کردہ اصولوں سے یکسر انحراف بھی کرتی ہیں۔ بڑی دیدہ دلیری ہے صاحب ان کی۔ قرآنِ کریم میں کھلی آیات اور واضح احادیث کی موجودگی میں ان کو جھٹلاتے ہوئے انتہائی بیباکی سے سڑکوں پر آجانا اور مظاہرے کرنا پھر اس دورِ حکومت میں جو بار بار نظام مصطفیٰؐ کے نفاذ کا دعویٰ کرتی چلی آرہی ہو تعجب ہوتا ہے۔

اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو حضورؐ کے زمانہ کا یہ واقعہ بھی ہے کہ ایک نابینا صحابیؓ رسول کریمؐ سے ملاقات کی خاطر تشریف لائے جبکہ حضورؐ اپنی ازواجِ مطہراتؓ وغیرہ سے محوِ گفتگو تھے۔ آپؐ نے ان خواتین کو پردے میں چلے جانے کا حکم دیا جس پر ان خواتین نے عرض کی یا رسول اللہ وہ تو نابینا ہیں اور حضورؐ نے جواب میں فرمایا کہ تم تو نابینا نہیں ہو! کیا صرف اس ایک واقعے سے پردے کا مسئلہ قطعاً واضح نہیں ہو جاتا۔

مجھے تو تعجب ان مسلمان مردوں پر ہوتا ہے کہ جنہوں نے ان خواتین کے مطالبات کو بغیر کسی جھجک اور تاخیر کے تسلیم کرتے ہوئے "ومما لیقدیٰ" کو ختم کر

سچ کہا ہے کسی نے کہ "عورت شیطان کا کھلونا ہے - اور مرد عورت کا -

یہ حالات اور یہاں کی بے لگام رنگا رنگی دیکھ کر تو خوف آتا ہے کہ خدا نخواستہ نظامِ مصطفےٰ کی آڑ میں اکبرِ اعظم کے "دینِ الٰہی" جیسی کوئی شئے تو نافذ ہونے والی نہیں ہے - اللہ رحم فرمائے ہم سب پر اور اسلام میں پورے پورے داخل ہوجانے کی توفیق و ہمت عطا فرمائے تاکہ عذابِ الٰہی اور گمراہی سے بچ سکیں آمین -

ڈاکٹر صاحب آپ بلا خوف و خطر دعوتِ حق دیتے رہیں کیونکہ اللہ تعالےٰ کا فرمان ہے کہ "جنہوں نے ہماری راہ میں کوشش کی ہم ان کو اپنا راستہ بتلائیں گے" اور یہ بھی کہ "دوزخ کے عذاب سے ڈرتے رہو جو نافرمانوں اور منکروں کیلئے تیار ہے اور اللہ تعالےٰ اور رسول اللہ کا حکم مانو - عجب نہیں کہ تم پر رحم کیا جائے" اور یہ بھی کہ "ظالموں پر خدا کی لعنت جو اللہ تعالےٰ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہیں اور لوگوں کے دلوں میں شبہے ڈال کر ان میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں -" یہ بھی تو اسی دانائے کل نے فرمایا ہے کہ "اے نبی ہم نے تمہارے پاس ایسی آیتیں بھیجی ہیں جن کا مطلب صاف اور واضح ہے اور ان سے وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو نافرمان ہیں" اور یہ بھی کہ "بہ تحقیق وہ آنکھیں اندھی نہیں بلکہ وہ دل جو سینے میں ہیں اندھے ہیں" لہٰذا آپ اپنا مشن جاری رکھیں - خدا آپ کو کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہمکنار فرمائے - آمین -

ڈاکٹر صاحب میرا خیال ہے کہ یہ مسلمان مرد بھی بڑی تعداد میں مغرب زدہ ہیں - اگر خواتین پردے کے سلسلے میں تو مرد داڑھی کے سلسلے میں - اگر زحمت نہ ہو تو ذرا ان کو بھی جھنجوڑ دیجئے - کیا اللہ کا یہ فرمان نہیں کہ "تمہارے لئے خدا کے پیغمبر عمدہ نمونہ ہیں" پھر یہ وہ نمونہ کیوں پیش نہیں کرتے - ہوسکتا ہے یہ بھی مظاہرے کریں - آج ہم سب کی حالت تو یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اور اس کے آخری نبی کی شان میں حمد و نعت لکھتے بھی ہیں اور خوشنما ترنم میں گاتے بھی ہیں - درس قرآن بھی دیتے ہیں اور بہترین قاری کہلاتے بھی ہیں مگر اللہ کے نبی کا نمونہ بننے کو تیار نہیں - حضرت فاطمہؓ خاتونِ جنت سے بے پناہ محبت و عقیدت کا اظہار بھی کرتے

ہیں مگر ان کے اس قول پر عمل کرنے کو بھی قطعاً تیار نہیں کہ وہ عورت کے لئے بہترین اور محفوظ ترین راستہ یہ ہے کہ کوئی نامحرم اس کو نہ دیکھے اور وہ کسی نامحرم کو نہ دیکھے"۔ حضرت غوث الاعظمؒ سے بے پناہ لگاؤ اور عقیدت کا اظہار کرتے نہیں تھکتے لیکن ان کی تعلیمات کے مطابق خود کو ڈھالنے کے لئے قطعاً تیار نہیں۔ مرد ہوں یا خواتین ایک ہی گمراہی کی کشتی میں سوار ہیں۔ عقیدت، احترام و محبت تو اصل میں پیروی سے ثابت ہوتی ہے۔ اصل بات بھی جب ہی بنتی ہے کہ جب ان کی پیروی اور تقلید کی جائے خواہ کتنا ہی طبیعت پر بار گزرے۔ ورنہ سب دکھلاوہ ہے۔

اللہ پاک معاف فرمانے والے ہیں۔ ابھی بھی وقت ہے کہ ہم مسلمان اپنے آپکو اسلام کے اندر پوری طرح سمو لیں ورنہ خدانخواستہ "ہماری داستان تک نہ ہوگی داستانوں میں"۔ مجھے رہ رہ کر حضور پرنورؐ کی وہ حدیث یاد آ رہی ہے جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ آپؐ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا کہ ایک وقت وہ آنے والا ہے کہ میری اُمت پر مخالفین (دشمنانِ اسلام) چڑھ دوڑیں گے۔ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ کیا اس وقت آپ کے اُمتی بہت کم ہوں گے۔ آپ نے فرمایا نہیں بے پناہ ہوں گے لیکن اُنکی ہیبت دشمنوں کے دل سے نکل چکی ہوگی کیونکہ یہ دین کا دامن چھوڑ کر دنیا کا دامن پکڑ لیں گے۔ کیا آج بالکل اسکے مطابق نہیں ہو رہا۔ دشمنوں نے مسلمانوں کا کیا حشر کیا ہوا ہے اور ہم ہیں کہ اب بھی راہِ حق و صداقت اختیار کرنے کو تیار نہیں۔ بلکہ راہِ حق دکھلانے والوں پر کیچڑ اچھال رہے ہیں۔ ان کے خلاف مظاہرے کر رہے ہیں مگر دینِ اسلام میں پوری طرح داخل ہونے کو تیار نہیں۔ خدا توفیق عطا فرمائے آمین۔ وَمَا علینا الا البلاغ

ہاجرہ بیگم سٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی

برائے توجہ!

قارئین میثاق سے گذارش ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں (شکریہ)

پنجاب بیوریجز کمپنی لمیٹڈ۔ فیصل آباد۔ فون: ۲۶۰۳۱
۲۳۹۳۱

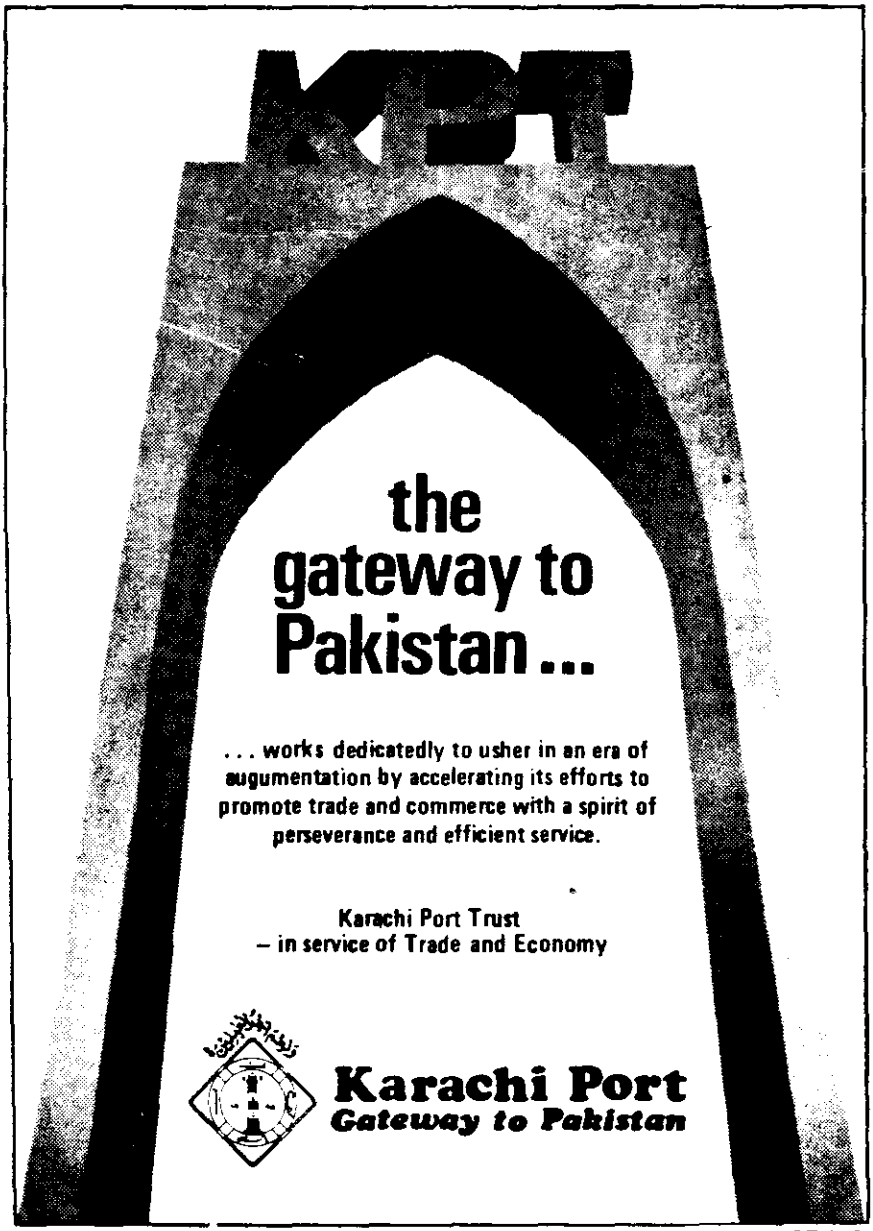

PID (Islamabad) Paragon ● KPT-11-R

Regd. L No. 7360
MONTHLY "MEESAQ" LAHORE
Vol. 31 OCTOBER 1982 No. 10

قدرتی گیس کا ضیاع روکیئے

ہمارے توانائی کے وسائل محدود ہیں ہم توانائی کے ضیاع کے متحمل نہیں ہو سکتے

گیس بچاکر
قومی معیشت کو
مستحکم بنائیے

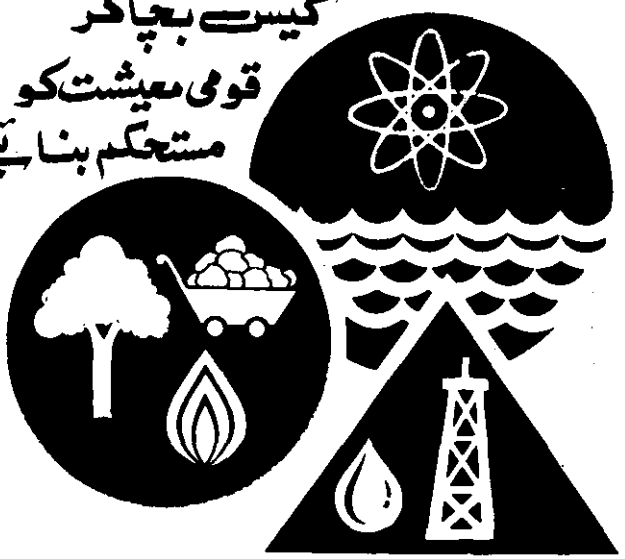

ہمارے ملک میں توانائی کے وسائل کی کمی ہے۔ توانائی کی ضروریات کثیر زرمبادلہ صرف کر کے پوری کی جاتی ہیں۔ ہماری صنعت، تجارت، زراعت کے شعبوں میں توانائی کی مانگ روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ آپ کی بچائی ہوئی توانائی ان اہم شعبوں کے فروغ میں کام آئے گی۔

قدرتی گیس بہت زیادہ
قیمتی ہے،
اسے ضائع نہ کیجئے

سوئی ناردرن گیس پائپ لائنز لمیٹڈ

SUI NORTHERN

SNGPL. 4/80

paragon